سوز و ساز

سوز و ساز

ابو الاثر حفیظ جالندھری
(المخاطب بہ ملک الشعراء حسان الملک بہادر خانصاحب)

کا

دوسرا مجموعۂ کلام

جس میں

مصنف کے اوّلین مجموعۂ سخن نغمہ زار کے بعد یعنی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک کا تمام متفرق کلام درج ہے۔
شعر کی یہی وہ کتاب ہے جس کو پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اوّل درجے کے انعام کا حقدار گردانا

ناشر

سلطان بک ڈپو۔ کالی کمان حیدرآباد

مطبوعہ برقی اعظم جاہی شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن

فہرست

عنوان	صفحہ
شب دوم	۴۰
نصف شب	۱۱
زینت افزائے چند اختر	[illegible]
[illegible]	۴۵
راوی میں کشتی	۴۸
شام رنگیں	۵۲
جناب	۵۵
مالیہ	۵۹
صبح و شام کو دریا	۶۲

عنوانات	صفحات
صدا الصحرا	
درّۂ خیبر	۲۰۲
شہر پومپی آئی کی آخری رات	۲۰۵
رقاصہ	۲۰۸
کنجوس سرمایہ دار	۲۱۳
غزلیات	
اگر کوئی بے نقاب کردے	۲۱۶
سزا دے گئے مجھے	۲۱۷
پشیمانیاں ہیں	۲۱۸
اب تو رہنے دو یہ دنیاداریاں	۲۱۹
گفتگو تو شریفانہ چاہئے	۲۲۰
خدا کا سہارا لئے ہوئے	۲۲۱
ایجاد میری	۲۲۲
بہت مشہور ہوں میں	۲۲۳
ہائے دنیائے فانی	۲۲۴
ایمان بھی نثار کرے	۲۲۴
کوئی اگر دیوانہ ہو جائے	۲۲۵

ترتیبِ دوم

سوز و ساز کی یہ دوسری ترتیب ہے۔ میں نے اس میں کہیں کہیں ہلکا سا ردّ و بدل کر دیا ہے۔ غزلوں پر عنوان قائم کئے ہیں کیونکہ اس قسم کے مجموعۂ کلام میں مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ کسی غزل میں مقطع اور کسی میں مطلع بڑھا دیا ہے۔ اپنی گذشتہ خامیوں اور کتابت کی اصلاح پر بھی توجہ دی ہے تاہم یہ دعوے نہیں کہ یہ ترتیب سہو و خطا سے پاک ہے۔

حفیظ

تمہید

اتفاق سے باغبان کی نظر ایک ایسے پودے پر جا پڑی، جو خودرو تھا۔ وہ خوش ہوا۔ اُسے خیال آیا۔ اگر یہ نہال سرسبز رہا، تو ضرور اچھا پھل لائیگا۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودوں کے ساتھ ساتھ اس نہالِ خودرو کی نگہداشت بھی شروع کر دی، اور اس کو ہر موسم میں زمینی اور آسمانی بلاؤں سے بچاتا رہا۔

اس پرورش کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ پودا جو پہلے کس مپرسی کی حالت میں تھا، اب جلد جلد بڑھنے لگا۔ آخر پھول

اور پھل لے آیا۔ اس کی شاخیں احسان کے بوجھ سے
جُھک گئیں اور اُس کے خام اور پختہ ثمر باغبان
کے سامنے آ گئے۔

حفیظ نے یہ تمثیل کہی، اور سوز و ساز کو اپنے
سب سے بڑے محسن
آنریبل جسٹس شیخ سر عبدالقادر صاحب قبلہ کے حضور
پیش کیا۔

ممدوح مُسکرائے اور نذر قبول فرما لی۔

حفیظ

۶ر فروری ۱۹۳۳ء

دیباچہ

(از پنڈت ہری چند اختر ایم، اے)

شاہنامۂ اسلام اور نغمہ زار وغیرہ کا مصنف اب کسی ماہر فن اور بلند آواز نقیب کی خدمات سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ مہذب محفل میں نووارد اور اجنبی کو بیشک تعارف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قاعدہ کی رو سے جب حضرت حفیظ نووارد اور اجنبی تھے انہوں نے اپنا تعارف اہل بزم سے خود بخود کر لیا تھا۔ پھر ۱۹۲۵ء میں اُن کے کلام کا سب سے پہلا مجموعہ "نغمہ زار" شائع ہوا تو ملک الشعرا حضرت مولانا گرامی قدس سرہٗ نے چند تعریفی یا تعارفی اشعار رکھ کر اور پروفیسر سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) نے چند سطور نثر لکھ کر یہ ضابطہ پورا کر دیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں "نغمہ زار" دوسری مرتبہ شائع ہوا تو میرے دوست پروفیسر تاثیر ایم اے نے ایک مختصر مگر جامع دیباچہ اس خیال سے بڑھا دیا کہ یہ طرز سخن بالکل نیا ہونے کے باعث اردو شاعری کی محفل میں نووارد کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس نرالے طرزِ سخن کی خصوصیات و امتیازات

پر (مختصر طور پر ہی سہی) روشنی ڈالنا تعارف کی شرائط میں داخل تھا۔

پس جہاں تک بزمِ شعر و سخن میں تعارف و تقریب کا تعلق ہے یہ کام ضابطہ کی حد تک انجام پا چکا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس تعریف کے ساتھ پطرس نے حضرت حفیظ کو بزمِ شعر و سخن میں پیش کیا تھا وہ اس تعریف کے اہل ثابت ہوئے ہیں یا نہیں۔ اور ان کے طرزِ شاعری کے متعلق جن خصوصیات اور امتیازات کا تاثیر نے دعوے کیا تھا انہیں اہلِ بزم نے تسلیم کر لیا ہے یا نامطبوع اور نامقبول کہہ کر رد کر دیا ہے۔

کسی شاعر کے کلام اور طرزِ سخن پر ہم دو پہلوؤں سے نظر ڈال سکتے ہیں۔ "یعنی موجودہ قبولیت اور قبولِ دوام کی توقع" حضرت حفیظ کی موجودہ قبولیت کا یہ عالم ہے کہ ان کی شاعری اور طرزِ سخن کو نہ صرف قبولِ عام کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے بلکہ بقول حضرت تاثیر قبولیت کی مضرتیں بھی لاحق ہو گئی ہیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء یعنی جب سے حضرت حفیظ نے مناظرِ قدرت کی تصویر کشی۔ چھوٹی چھوٹی مترنم بحروں میں جذبات کے اظہار اور دردِ دل کو ملکی دھنوں اور گیتوں کے سانچہ میں ڈھالنے کا آغاز کیا ہے۔ اردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھیے شعر و سخن کی کسی محفل میں شریک ہو کر اندازہ کیجیے

آپ کو بیک وقت حفیظ کے تتبع کے متعدد نمونے نظر آئیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ تتبع کرنے والوں میں سے اکثر و بیشتر فطری مناسبت سے محروم ہونے کے باعث بہت بُری طرح ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو مضحکہ کا سامان بنا لیتے ہیں لیکن سوال کامیاب یا ناکام نقل کا نہیں بلکہ رجحان اور قبولیّت کا ہے۔ بے بضاعت اور کم سواد لوگوں کی لغزشوں کو آپ قبولیّت کی مضرتیں کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر تتبع واقعی قبولیّت کا سب سے نمایاں اعتراف ہے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ "رنگِ نَو" جس کی تخلیق کا باعث حفیظ ہے اُردو دُنیا کو بڑی حد تک متاثر کر چکا ہے۔ ایک طرف سخن فہم اور ذوقِ صحیح رکھنے والا طبقہ حفیظ کو مخترع تسلیم کر رہا ہے۔ دوسری جانب سخن سنج معاصرین کو یہ سیلابِ رنگ بہائے لئے جا رہا ہے۔ مبتدیوں کا ذکر نہیں کہنہ مشق اور پرانے "سکول" کے مستند شعرائے اُردو بھی اس "طرزِ نَو" کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ طرز نہ صرف مقبول ہو رہا ہے بلکہ قدامت پرستی کے وہ دعوے دار بھی جو ابتدا میں بعض گفتنی یا ناگفتنی وجوہ کی بنا پر حضرتِ حفیظ کی جدّت کو بدعت قرار دے کر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے اب اپنے کو حفیظ کے تتبع پر مجبور پاتے ہیں ✦

کا وہ سحر کار قلم بھی قائم نہ رکھ سکا جس نے اس ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو آفتاب عالمتاب ثابت کرنے کی کوشش میں اردو شاعری کو کم از کم پچاس سال پیچھے پھینک دیا۔

ان حالات کے پیش نظر بظاہر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قبولیت کے پیدا ہونے کا وقت مقرر کرنا اور اس کے بڑھنے پھیلنے گھٹنے سمٹنے سے اس کی عمر کا اندازہ لگانا سخت مشکل ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ابنائے زمانہ کس کو کس وقت زندہ درگور کر دینگے۔ اور کس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر سر پر رکھ لیں گے۔ آنکھوں سے لگائیں گے؟

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ظاہری موانع کے باوجود قبولِ دوام کے متعلق تھوڑا بہت اندازہ کر لینا ناممکن نہیں مندرجہ بالا بیان سے قبولیت کے اندازہ کی دشواریوں کے علاوہ کچھ اور بھی معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جن شعرا کو ہمعصروں کی بدمذاقی اور مذہبی مجلسی یا مقامی تعصبات کے باعث یا بعض دیگر حالات کی بنا پر اپنی موت کے بعد قبولیت حاصل ہوئی اُن کے کلام میں کچھ ایسی باتیں ضرور موجود تھیں جن کا کسی نہ کسی وقت مرغوبِ خلائق ہونا لازمی امر تھا۔ حافظ کے کلام میں اکثر باتیں وقت کی ضرورت اور حالات کے مطابق تھیں مگر طرزِ سخن اور موضوعِ کلام اس قدر نمایاں

قبولِ دوام کے متعلق میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیصلہ کرنے میں جلد بازی سے کام لینا سخت خطرناک ہے۔ قبولیت ایک عجیب وغریب مخلوق ہے کہ مر مر کر زندہ ہوتی ہے اور جی جی کر مرتی ہے۔ ایک وقت پر جسے کوئی پوچھتا بھی نہ ہو کچھ مدت کے بعد وہی چپکنے لگتا ہے۔ اور کل جس کے جھنڈے گڑے تھے آج اس کا کوئی نام بھی نہیں لیتا۔ اندھا شاعر ہومر جب دنیا میں موجود تھا تو اس کے اشعار سن کر کوئی بھیک بھی مشکل سے دیتا تھا۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ یونان کے وہی سات شہر جن کے گلی کوچوں میں وہ دربدر خاک بسر لاٹھی ٹیکتا پھرتا تھا اس کی جائے ولادت ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے لگے۔ ایرانی شعرا میں سے ایک طرف عمر خیام ہے جس کی قسمت دیکھتے کتنی مدت کے بعد جاگی اور کہاں جاکر جاگی۔ دوسری جانب حافظ شیراز ہیں کہ انکی قبولیت ان کی زندگی سے اس وقت تک بدستور قائم ہے۔ اور نہ جانے کبتک قائم رہے گی۔ اردو شاعروں میں غالب اور ذوق کو لیجئے۔ اپنی زندگی میں ذوق ملک الشعرا خاقانیٔ ہند تھا اور غالب مہمل گو۔ لیکن آج ملکِ سخن میں غالب کا سکہ رواں ہے اور ذوق کی شہرت آزاد مرحوم

مقامی رنگ کے باوجود زمان و مکان کی زنجیروں میں ایسی بُری طرح جکڑے ہوئے نہیں تھے کہ آئندہ زمانہ اور دیگر ممالک کے باذاق لوگ حافظ کے کلام سے محظوظ اور مستفید نہ ہو سکیں۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی میں بھی مقبول ہوا اور اب تک مقبول چلا آتا ہے۔ خیام کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ نہ صرف اُس کے ہمعصروں کی بدمذاقی اور تنگ نظری پر دال ہے بلکہ اس افسوسناک حقیقت کا بھی کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایشیائی نقاد یورپی عینک کے بغیر اپنی بصارت کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے اور بعض اوقات تو انہیں اس عینک کے بغیر کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ غالب کی مثال سے جہاں وقتی رائے کی بے وقعتی کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ راز بھی کھلتا ہے کہ بعض قابلِ قدر جدتیں قبل از وقت معرضِ وجود میں آکر کچھ مدت کے لئے نامطبوع بلکہ مردود ہو جاتی ہیں مگر وقت آنے پر اُن کی ایسی قدر ہوتی ہے کہ ملک کے لٹریچر میں دوامی جگہ حاصل ہو جاتی ہے۔ پس اگر عام شعری محاسن کے علاوہ کسی شاعر کے کلام کی نمایاں خصوصیات اور دلچسپی کی وسعت کو پیشِ نظر رکھ کر قبولِ دوام کا اندازہ کیا جائے تو اغلب یہی ہے کہ وہ اندازہ بہت بڑی حد تک درست ہوگا۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر اس کسوٹی سے کام لیا جائے تو ان مبصرین کی رائے کو درست تسلیم کر لینے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا جن کے

نزدیک اُردو ادب میں حفیظ کی شاعری کا مقام جاودانی ہے +

حضرتِ حفیظ کے کلام اور طرزِ سخن کی اہمیّت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے سے پہلے چند امور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ عام طور پر کسی شاعر کے نتائجِ طبع کو اس نظر سے دیکھا جاتا ہے جیسے وہ متقدمین کی تصانیف اور موجودہ ماحول سے الگ تھلگ یکا یک ایک خلا میں پیدا ہو گئے ہوں ان پر غور کرتے وقت اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ جس وقت اس خاص مُصنّف نے قلم سنبھالا اس وقت مُلک کا لٹریچر کس مرحلہ تک پہنچ چکا تھا اور مُصنّف کے معاصرین کا عام رجحان کیا تھا۔ لیکن یہ طریقہ درست نہیں کیونکہ اس طرح مصنّف کے کارناموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے مصنّفوں پر ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت کا مقولہ کتنا ہی صادق آتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیائے ادب کی ہر ایک بستی میں ان عمارتوں کی بنیادیں قدما کے کارناموں کی صورت میں پہلے ہی موجود ہوتی ہیں اور ہر نئے مُصنّف کو اپنی عمارت ان بنیادوں پر کھڑی کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کسی نئے معمار کی چابکدستی کا اندازہ صرف عمارت کی ساخت یا شکل و صورت سے نہیں ہو سکتا بلکہ ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس نے یہ عمارت کن بنیادوں پر کھڑی کی اور ان بنیادوں پر اس قسم کی عمارت اٹھانے میں کس قدر ہنر مندی کی ضرورت تھی

اسی طرح ہر مصنف اپنے ماحول سے بھی لازمی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کو اگر اس کے سوانح حیات قرار دیا جائے تو لٹریچر کو اسکے خود نوشت سوانح حیات کہنا بالکل بجا ہوگا۔ اس لئے کسی زمانہ کے مصنفوں کی تصانیف ایک طرف تو قوم کے خود نوشت سوانح حیات کا ایک باب ہوتی ہیں اور دوسری جانب یہ باب خود اس زمانہ کی روداد پر مشتمل ہوتا ہے۔ کسی دور کے ادبی کارناموں سے ہم اس زمانہ کے متعلق بہت سی باتوں کا اندازہ کر سکتے ہیں چنانچہ مختلف محققین نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں لٹریچر سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کوئی مصنف ماحول کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا اسے قوم کے خود نوشت سوانح عمری کے اس باب کی تکمیل میں حصہ لینا پڑتا ہے جو خود اس کے زمانہ کی داستان کا حامل ہوتا ہے۔ پھر وہ ماحول سے بے نیاز کیونکر ہو سکتا ہے؟ پس کسی مصنف کی تصانیف کو خلا کی پیداوار سمجھنے کے بجائے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے اپنے زمانہ کی داستان لکھنے میں کس قدر حصہ لیا۔ یہ حصہ کس خوبی سے لکھا گیا اور اس حصے کو نہ صرف اس باب میں جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے بلکہ ساری داستان میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طرح سے کر سکتا ہے۔ یا تو پرانی روش پر چل کر ہی ادب کی تکمیل و تزئین میں حصہ لے

اور یا پھر اپنے لئے نئی راہیں نکال کر ملک و قوم کے ادبی سرمایہ میں بیش بہا اور قابلِ قدر اضافہ کا باعث بنے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر زمانے میں کسی قوم کا ادب بعض خاص رائج الوقت رجحانات کے ماتحت پرورش پاتا ہے لیکن ایک طباع شاعر جہاں پرانی روش کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کر لیتا ہے وہاں اسے اپنے عہد کی رسمی زنجیروں کو توڑ ڈالنے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنے زورِ طبع سے معاصرین کا مذاق بدل کر اس میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہ سراسر زمانہ کے مذاق کے تابع رہ کر عام رَو میں بہ جانے پر قانع نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بازار کی مانگ کی نسبت زمانے کی ضرورت کا زیادہ خیال رکھتا ہے۔ اور اسی ضرورت شناسی پر اس کے تفوق کا انحصار ہے۔

حفیظ کے طرزِ سخن کو کسی خاص ندرت یا ایک آدھ جدت کی بنا پر اچھوتا نہیں کہا جاتا بلکہ اردو شاعری کی عام روش اور افتاد کو مدِ نظر رکھیں تو حفیظ کی شاعری ہر لحاظ سے نرالی ہے۔ موضوعِ کلام، مضمون و خیالات، بحور و قوافی کے استعمال اور موضوعِ کلام سے ان کی مناسبت۔ انداز، منظر کشی اور مناظر کا تجزیہ، تشبیہات و تلمیحات غرض کسی پہلو سے دیکھئے حفیظ کا کلام انقلاب انگیز جدتوں کا حامل نظر آئیگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اب تک "ہماری شاعری" کہتے رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر اس کے سوا

کسی اعتبار سے ہماری نہیں کہ اس کے مصنّف ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے اس شاعری میں خیالات و جذبات۔ محاورات و طرزِ تکلّم۔ "پشت منظر" (بیک گراؤنڈ) اور اصل تصویر سب کچھ ایران کا ہے۔ اور ہندوستان کا کچھ بھی نہیں۔ حتّٰے کہ اس شاعری کی بنا پر تہذیب و تمدّن اور طرزِ معاشرت وغیرہ کا مقابلہ کر کے اگر کوئی مستشرق ہندوستان کو مملکت ایران کا ایک صوبہ یا ضلع کہہ دے تو میرے خیال میں ہمیں اس کو مطعون کرنے کا کوئی حق نہ ہوگا۔

نغمہ زار کے دیباچہ میں پطرس لکھتے ہیں۔ "ہمارے شاعر بسول سے ترکِ شیرازی پر مست ہیں"۔ یہ فقرہ بڑا بلیغ اور پُر معنی ہے۔ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس قسم کی مصنوعی اور صرف شاعر کی اپنی ذات کو فریب میں مبتلا رکھنے والی شاعری کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے اور جس کی بنا پر ہماری اردو شاعری نے عام طور پر ایک غیر فطری شکل اختیار کر لی ہے۔ لیکن اگر اس فقرے کے صرف الفاظ ہی کو لیا جائے تو یہ صورتِ حالات بھی کچھ کم باعثِ ندامت نہیں۔ مانا کہ ہندوستان میں رستم و اسفندیار ایسا کوئی شہزور پیدا نہیں ہوا۔ اور ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی ہندوستانی کو گرز اور کمان سے کام لینے کی طاقت اور اہلیت عطا نہیں

ہوئی۔ مانا کہ تیغِ ہندی کی تعریف بھی ایرانی شاعروں نے محض مروّت کی راہ سے یا شاید بر سبیل استہزا کر دی تھی اور اس لئے ہمیں اپنی رزمیہ شاعری میں اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی تسلیم کہ یہاں تہذیب و تمدّن کی روایات سرے سے موجود ہی نہیں۔ لیکن کیا اس وسیع برِ اعظم میں جہاں دنیا کی انسانی آبادی کا پانچواں حصّہ بستا ہے کسی کمبخت کو عاشق ہو جانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی؟ اور اگر ہوئی تو کیا اس کا محبوب ایسا ہی گیا گزرا تھا کہ ہمارے شاعروں کو اس کا ذکر تک گوارا نہیں؟

یہ تو خیر اپنی اپنی پسند کی بات سہی۔ لیکن ہمارے اکثر شعرا کو ہندوستان کی قدیم یا موجودہ زندگی میں بھی کوئی ایسی خصوصیت نظر نہیں آتی جو کلیتہً ہندوستانی ہو۔ اور تو اور یہاں کے موسم اور قدرتی مناظر بھی کسی اعتبار سے قابلِ امتیاز نہیں معلوم ہوتے مثلاً بسنت ہندوستان میں بہار کا پیش خیمہ ہے اور ہمارے موسمِ بہار کی چند خصوصیات بھی ہیں۔ لیکن ہمارے شاعروں کے موسمِ بہار میں وہی "بہمن و دے کا چمنستان سے عمل" اٹھتا ہے۔ اور تیغ اردی ملکِ خزاں کو "مستاصل" کرتی ہے۔ قدرت کی قلمکاریوں کا مقابلہ صرف مانی اور بہزاد کے کارناموں سے ہو سکتا ہے۔ سرسوں نہیں پھولتی بلکہ زمین پر عکسِ گلبن پڑتا ہے۔ نرگسِ شہلا کے سوا

کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر ان ایرانی باغوں اور مرغزاروں میں بلبل کے سوا اور کس کا زمزمہ فردوس گوش بن سکتا ہے؟

علیٰ ہٰذا اس موسم کا استقبال بسنت یا ہولی مناکر نہیں بلکہ ایسے انداز میں کیا جاتا ہے جس سے کنار رکنا یاد کی بزم مے نوشی اور گلگشتِ مصلےٰ کا حظ حاصل ہو۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ سب کچھ تو ایران میں ہوتا ہے اور بہار ہندوستان میں آجاتی ہے!! اب اس بہار کے ذکر سے کسی ہندوستانی کے دل میں کن واقعات اور کن مناظر کی یاد تازہ ہو سکتی ہے؟ اور جب ان بیچاروں کو اس شاعری میں کوئی چیز مانوس ہی معلوم نہ ہو تو وہ اس سے کیا لطف حاصل کر سکتے ہیں؟

بخلاف اس کے حفیظ کے ہاں بسنت میں سرسوں پھولتی رہے۔ باغوں اور کھیتوں میں ہندوستانی بہار آتی ہے۔ لمکے ڈور اور پتنگ کی خاطر باہم دست و گریباں ہوتے ہیں۔ کوئی مار کھاتا ہے اور کوئی ہنستا کھلکھلاتا ہے۔ خون میں جوش آتا ہے۔ عشق و جنوں کی مستی پیدا ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب گھر میں ایک عصمت مآب شوہر پرست ہندوستانی عورت نے پھولوں کے زرد گہنے تو پہن لئے ہیں۔ لیکن شوہر پردیس میں ہے۔ اس لئے ؎

ہے مگر اُداس
نہیں پی کے پاس
غم و رنج و یاس
دل کو پڑے ہیں سہنے

اسی طرح برسات آتی ہے تو جہاں باغوں میں بلبلوں کے بجائے کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں سنائی دیتی ہے وہاں آموں کے نیچے جھولے ڈال کر پینگیں بڑھانے والی ماہ پیکروں کے پیارے پیارے گیتوں کی میٹھی رسیلی تانیں بھی فردوسِ گوش بنتی ہیں۔ ساتھ ہی حفیظ ننھی بچیوں کی ہنڈ کلھیا اور گڈے گڑیا کی شادی کو بھی نہیں بھولتا۔ ذرا یہ جھولے کا منظر دیکھئے کس قدر مانوس معلوم ہوتا ہے۔ اور شاعر کی نظر جزئیات پر کس انداز سے پڑتی ہے۔ لیکن ہندوستانی عورت کی نمایاں ترین خصوصیات اس مستی اور الھڑپنے کی ہڑبونگ میں بھی حفیظ کے پیشِ نظر رہتی ہیں۔ چنانچہ جھولا جھولنے والیاں ہنستے کھیلتے مسکراتے منہ پڑاتے اور ہلڑ مچاتے مچاتے مچاتے یکایک جھینپ بھی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد ؎

اٹھلا رہی ہیں   اترا رہی ہیں
خوبانِ ہندی   حُورانِ ارضی   رونق گھروں کی
نازک دوپٹے   رنگین ہلکے
سر پہ سنبھالے   شانوں پہ ڈالے
مینہ لاکھ برسے   جی لاکھ ترسے
نکلیں نہ گھر سے
شوہر کے ڈر سے

پھر بھی نہیں بلکہ ؎
اپنی نظر سے   شرما رہی ہیں

نغمہ زار کی ان نظموں اور جلوہ سحر۔ تاروں بھری رات وغیرہ کو چھوڑ کر سوز و ساز کی نظموں کو دیکھیے تو ان میں بھی یہ مقامی رنگ اسی طرح نمایاں نظر آئے گا۔ پریت کا گیت۔ چاندنی میں کشتی۔ شام رنگیں جاگ سوزِ عشق اور چناب وغیرہ کو پڑھ کر قدیم اور موجودہ اردو شاعری سے مقابلہ کیجئے۔ زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اس مقامی رنگ کے باوجود نظموں کی دلچسپی محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ غیر ہندی شائقینِ ادب کو بھی اس سے وُہی حظ حاصل ہوگا جو خالص

ہندوستانی شاعری سے ہونا چاہئے اور یہ حفیظ کی قادرالکلامی اور وجدان صحیح کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

تشبیہات و تلمیحات اور بحور و قوافی کے معاملہ میں بھی اُردو شاعری اصولی نقائص سے خالی نہیں۔ دوسری زبانوں میں تشبیہ و استعارہ اور تلمیحات کے مانوس ہونے کے باعث عوام الناس بھی شعر سے پُورا پورا حظ حاصل کر سکتے ہیں اور شاعرانہ اشاروں کنایوں کو فوراً سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں شاعری کی فضا اسقدر نامانوس ہوتی ہے کہ عوام تو درکنار خواص بھی شعر سے وہ لطف حاصل نہیں کر سکتے جو مانوس فضا میں ایک خاص تڑپ کا حامل ہوتا ہے۔ بحور و قوافی کا سلسلہ بہت بڑی حد تک اجنبی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی موسیقی اور اُردو شاعری کے تال سم میں بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ملکی دھنوں سے مسلسل غفلت بلکہ دانستہ بے اعتنائی روا رکھی گئی ہے حتیٰ کہ ہندوستانی گیت اُردو شاعری کے نام نہاد عروضیوں کو اس لئے غیر موزوں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ کہ ان میں ملکی زحافات سے کام لیا جاتا ہے۔ کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ جو سُر اور تال ہندوستانیوں کی روح میں بسے ہوئے ہیں۔ ان کو تو اجنبی اور غیر مانوس گردانا جائے، اور

غیر مانوس زیر و بم ہمارے اشعار کی موزونیت یا عدم موزونیت کا معیار بنا لیے جائیں؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے شعراء کو موزونیت کے قدرتی معیار سے کام لینے کے بجائے جس میں لازمی طور پر نسبتاً بہت جلد مہارت حاصل ہو سکتی ہے ایک اجنبی یا تقریباً اجنبی میزان کا استعمال سیکھنا پڑتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُردو شعرا میں سے پانچ فیصدی بھی عروضی نکات سے کما حقہٗ واقفیت کا دعوےٰ نہیں کر سکتے*

لیکن سوال صرف عروضی مہارت کا نہیں۔ اصل بحث یہ ہے کہ آیا یہ عربی اور ایرانی اوزان سب کے سب ہندوستانی کانوں کو مانوس اور پسندیدہ معلوم ہوتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض اوزان ہمارے ہاں پہلے ہی موجود ہیں یا کم از کم ہندوستان میں بھی خوشگوار معلوم ہو سکتے ہیں۔ ان سے ضرور کام لیا جائے لیکن جو اوزان قطعاً اجنبی اور نامانوس ہونے کے باعث ناگوار معلوم ہوتے ہیں ان بھاری پتھروں کو چوم کر چھوڑ دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ مثال کے طور پر بحر منسرح کو لیجیے۔ یہ عربی بحر ایرانی فضا میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایرانی شاعر

اس بحر میں لکھا ہوا فارسی کلام اپنے مخصوص لہجہ میں پڑھ کر سنائے تو واقعی حظ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اردو شاعری کے لئے یہ بحر نہ صرف اجنبی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس میں لکھے ہوئے اردو اشعار کے متعلق غیر موزونیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس بحر کو زورِ طبع کی نمایش کے لئے ضروری سمجھتے ہوں۔ مگر اس نمائش کا نتیجہ "مغزِ ما خورد و حلقِ خود بدرید" کے سوا کچھ نہیں۔ پس اگر ایرانی شعرا اس بحر پر جان چھڑکتے ہیں تو چشمِ ما روشن دل ماشاد لیکن ہمیں خواہ مخواہ پھڑ پھڑانے کی کیا ضرورت ہے؟

میں یہ نہیں کہتا کہ حفیظ نے قدیم رنگ اور قدیم طرزِ سخن سے کوئی سروکار نہیں رکھا یا اجنبی عروض سے کامل بے اعتنائی کا برتاؤ کیا ہے۔ حفیظ کے ہاں بھی اردو شاعری کی قدیم خصوصیات موجود ہیں۔ اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ حفیظ کو اپنی عمارت انہی بنیادوں پر کھڑی کرنی تھی۔ اور وہ ماحول کے اثر سے بھی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن باذاق حضرات پر کلامِ حفیظ کے مطالعہ سے فوراً واضح ہو جائیگا کہ قدیم رنگ میں بھی شاعر نے خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کرتے ہوئے تقریباً تمام فضولیات کو ترک کر دیا ہے اور عام طور پر

صرف انہی خصوصیات کو لیا ہے جو ہر لحاظ سے پسندیدہ یا کم ازکم قابلِ برداشت نہیں۔ اس کے ساتھ ہی جدّت کا پہلو اس قدیم رنگ میں بھی نمایاں ہے۔

مَیں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شاعر اپنی زبان اور ادب کی خدمت دو طریقوں سے کر سکتا ہے۔ قدیم اور رائج الوقت طرز کی تکمیل میں حصہ لے کر یا نئی راہیں نکال کر۔ لیکن حضرت حفیظ کے متعلق بے تامل یہ دعوےٰ کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ہر دو طریق اختیار کئے اور دونوں پہلوؤں میں نہایت ہی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ قدیم اُردو شاعری اور قدیم طرزِ سخن کی تکمیل و تزئین اور اصلاح و تہذیب کے سلسلے میں حفیظ کے کارنامے اس قدر اہم اور قابلِ قدر ہیں کہ اُردو شاعری ہمیشہ ان کی ممنونِ احسان رہے گی۔ لیکن حفیظ کا پروگرام یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ یہ تزئین و تہذیب ابتدا تھی اس انقلاب کی جو حفیظ نے اردو شاعری میں پیدا کیا ہے اور جس کے بغیر ہمارا ادب بڑی حد تک پسماندہ تھا۔

مثلاً اُردو ادب کا دامن مناظرِ فطرت کی تصویروں سے خالی ہے۔ اور گیت کا تو ذکر ہی جانے دیجئے۔ یہ وہ صنف ہے جس کی طرف کسی

نے توجہ ہی نہیں کی۔ حالانکہ شعر اور موسیقی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ موسیقی اور ہندوستانی موسیقی۔ جو ہندوستانی طبائع پر زبردست اثر رکھتی ہے کیا اس کا اُردو شاعری پر اتنا حق بھی نہ تھا۔ کہ ہمارے شعرا اپنے سوز و گداز کا اظہار کرتے وقت اُس سے کام لیتے؟

دنیا بھر کی زبانوں میں گیت کو ذوق و سرمستی اور سوز و گداز کا بہترین مظہر مانا گیا ہے۔ اُردو شاعری میں حفیظ اس مخصوص صنف کا موجد ہے اور کامیاب موجد۔ اس کے گیتوں نے اُردو شاعری میں ایک نئی لذت ایک نیا رس پیدا کر دیا ہے۔

تقریباً یہی کیفیت حفیظ کے اندازِ "منظر کشی" کی ہے۔ وہ بحر اور وزن یا تشبیہ و استعارہ ہی سے نہیں۔ اپنی نظم کے ایک ایک لفظ سے ایک ایک منظر کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنے پیش نظر منظر کے لئے ہر لحاظ سے مناسب بحور اور مناسب الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اس انتخاب اور استعمال میں حسنِ صوتی اور حسنِ معنی دونوں سے کام لیتا ہے۔ اور اسی طرح وہی کیفیت دوسرے پر وارد کر دیتا ہے جو خود اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

حفیظ کا فن یہ ہے۔ کہ لفظ دوسرے لفظ پر۔ مصرع دوسرے

مصرعے پر اور شعر دوسرے شعر پر اس طرح اضافہ کرتا ہے جس سے دیدہ و دل کے سامنے پوری تصویر بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لطافت اور سادگی اور دلآویزی کے ساتھ۔ کہ اس میں شاعر کی اپنی ذات اور گرد و پیش کی خصوصیتیں زائل نہیں ہونے پاتیں۔

منظر کشی کا یہ اسلوب قادر الکلامی اور قوت اختراع کا زبردست ثبوت ہے۔ اس کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ حفیظ کے اس رنگ سخن نے "فطری شاعری" کی دنیا میں ایک بالکل نئے اور انقلاب انگیز باب کا اضافہ کیا ہے۔

بحور و قوافی کے متعلق حفیظ کا اجتہاد اس قدر اہم ہے کہ ان کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت بن گیا ہے۔ "ڈگر پرست" فاعلاتیوں کے جذبات کا احترام اس پہلو میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن صرف اس قدر کہ دوسری جانب ہندوستانی کانوں کو سمع خراشی کی شکایت کا موقع پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر انہوں نے بعض اجنبی بحور و اوزان کو چھوڑ دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ ان کی جگہ نئے اوزان پیش کر کے اردو شاعری کے سرمایہ میں اضافہ

اور میدان میں وسعت پیدا کی ہے۔ چند بحور و اوزان ترک کر دینا
کسی باذاق شاعر کے لئے کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ اصل کام نئے
اوزان کی تلاش کا تھا جس میں انتخاب اور انتخاب در انتخاب کی
ایسی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ ان پر قابو حاصل کر لینا حفیظ ہی
کا کام تھا۔ ظاہر ہے کہ غیر مانوس اور سمع خراش اوزان کے بجائے
محض چند ہندوستانی اوزان پیش کر دینا کافی نہ تھا بلکہ ایسے نعم البدل
منتخب کرنے کی ضرورت تھی جنہیں اردو شاعری آسانی سے قبول
کرلے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ ان کی چولیں اردو
شاعری کے موجودہ ڈھانچے میں بالکل ٹھیک بیٹھ جائیں۔ پھر
ان نئے اوزان کو کامیابی سے رواج دینے کے لئے ضروری تھا کہ
کسی موضوع پر نظم لکھتے وقت ان منتخب اوزان میں سے بھی ایسا
وزن منتخب کیا جائے جو نفس مضمون کے ساتھ پوری پوری مناسبت
رکھتا ہو۔ آپ نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں اس قسم کی داستانیں
سنی ہونگی۔ کہ ایک مرتبہ جب کہ آسمان پر بادلوں کا نام و نشان
تک نہ تھا اور آفتاب عالمتاب پوری شان سے جلوہ افروز تھا
بیجو باورا نے ملہار گایا اور آناً فاناً گھنگھور گھٹائیں اٹھ کر موسلا دھار

میگھ برسانے لگیں۔ یا تان سین نے آدھی رات کو دیپک راگ
چھیڑ دیا اور شہر بھر کے بجھے ہوئے چراغ خود بخود روشن ہو گئے۔
آپ ان داستانوں اور موسیقار کے متعلق مشہور و معروف روایت
کو من گھڑت اور ایامِ جہالت کی فرضی یادگار جو چاہیں کہہ لیں
لیکن موضوعِ کلام اور بحور و اوزان کی باہمی مناسبت کی ضرورت
اور اہمیت کی طرف جو اشارہ ان میں موجود ہے اسے نظر انداز نہیں
کر سکتے۔ دُور کیوں جاؤ۔ خود مروّجہ بحور و اوزان میں سے بعض خاص
اوزان کو اُردو شاعری میں بھی بعض خاص موضوعات کیلئے مخصوص
یا قابلِ ترجیح سمجھا جاتا ہے۔

حفیظ نے اس انتخاب میں جس بالغ نظری اور ذوقِ صحیح کا
ثبوت دیا ہے وہ اُردو شاعری میں اپنی مثال آپ ہے۔ "بسنت"
اور "ابھی تو میں جوان ہوں" کے "چلنت" اوزان میں کس قدر مستی
ہے۔ کتنا جوش ہے! "جلوۂ سحر" کے نفسِ مضمون سے قطع نظر
صرف زیر و بم ہی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات
خوابِ راحت سے بیدار ہو گئی ہے اور ایک آخری انگڑائی
ساتھ تمام سستی اور غنودگی کو پرے جھٹک کر روزانہ معمولات

کے لئے تیار ہو رہی ہے۔ دوسری جانب "تاروں بھری رات" سُنتے وقت نہ صرف دُنیائے ہست و بود کے محوِ خواب ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود سامعین پر بھی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے "برسات" کی نظم جتنی دیر آپ سُنتے رہیں یہی محسوس ہوگا کہ آپ برسات کے موسم میں کسی باغ کی سیر کر رہے ہیں۔ جھولا جھولنے والیاں ملار گا رہی ہیں اور ان کے ارمانوں بھرے گیت سُن کر دل میں ہوک سی اُٹھ رہی ہے۔

اسی طرح سوز و ساز کی نظموں میں "فرشتہ کا گیت" دیکھئے اُس کا وزن آسمانی نغموں کے لئے کس قدر موزوں ہے! کانوں کے ساتھ دل بھی یہی محسوس کرتا ہے کہ ایک رحمت کا فرشتہ ہاتھ میں چھوٹی سی ستار لئے بے فکری کے عالم میں تانیں اُڑاتا پھر رہا ہے کہ ؎

دیکھ اس دُنیا کا نظّارہ
میرے ساز کے تاروں میں

"پریت کے گیت" میں "پریم رس" کی مسلسل "قطرہ زنی" دل کو بغض و عناد کے میل سے پاک کرتی محسوس ہوتی ہے لیکن اس

تقاطر کے آگے نظم کا وزن دل میں پریم رس کو قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا جاتا ہے۔ "جاگ سوزِ عشق" کو پڑھئے شاعر کے ساتھ نظم کا وزن بھی فریاد کر رہا ہے۔ "شہسوارِ کربلا" ایسی نظمیں عام طور پر صرف اظہارِ عقیدت کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ لیکن حفیظ نے دوسرے ضروری محاسن کو نظر انداز نہیں کیا۔ اور اس نظم کے وزن پر غور کرو۔ محض اصوات سے میدانِ جنگ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مَیں بخوفِ طوالت دوسری نظموں کے ذکر اور تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ خود پڑھ کر مختلف نظموں کے بحور و اوزان کی مناسبت کا اندازہ کر لیجئے۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود بلا ارادہ نہیں ہو گیا بلکہ شاعر کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہے۔ حفیظ کو اس "حسن" کی ضرورت و اہمیت اور حسنِ انتخاب میں اپنی کاوش و کامیابی کا پورا پورا احساس ہے اور وہ بالکل بجا دعویٰ کرتا ہے ؎

کیا پابندِ نَے نالے کو مَیں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

حفیظ کے اس دعوے کی صحت اور اس طرزِ خاص کے نوایجاد ہونے کا سب سے نمایاں ثبوت اُس رویہ میں موجود ہے جو ان کے مخالفوں نے اپنے قصرِ شہرت کی بنیادوں کو متزلزل دیکھ کر اختیار کیا تھا۔ نیا سیلاب اس قدر اچانک آیا کہ یہ لوگ بھونچکے رہ گئے اور اس بوکھلاہٹ میں نئی شاعری کی تمام خصوصیات سے آنکھیں بند کر کے یہ "پراپاگنڈا" کرنے لگے کہ حفیظ کی کامیابی اور روز افزوں مقبولیت محض اس کی مترنم آواز کا نتیجہ ہے۔ اس "پراپاگنڈے" میں اس قدر شدت سے کام لیا گیا کہ خود پراپاگنڈا کرنے والوں کو بھی اپنے دعووں کی صداقت کا یقین سا ہو گیا۔ چنانچہ اس غلط فہمی کے ماتحت لاہور میں مدتوں گلے بازی ہوتی رہی۔ جس کسی کی آواز میں ذرا سا لوچ تھا وہی شاعر بن بیٹھا۔ اور الٹی سیدھی تک بندیوں کو گا بجا کر اُردو ادب میں "بے بہا اور قابلِ فخر اضافہ" کرنے لگا۔ شعر اور نغمہ میں جو گہرا تعلق ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں لیکن نغمہ بذاتِ خود شعر نہیں کہلا سکتا۔ حضرت امیر خسروؒ نظم کو عروسِ خوب اور نغمہ کو اُس کا زیور قرار دے کر فرماتے ہیں ؎

عیب نبود گر عروسِ خوب بے زیور بود

پس اگر عروس خوب "بازیور" ہو تو سبحان اللہ اور اگر بے زیور ہو تو بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن عروس کا خوب ہونا ضروری ہے۔ بلکہ میرے خیال میں تو عروسِ خوب کو بھی کوئی زیور اُسی صورت میں زیب دے سکتا ہے۔ جب کہ وہ اس کے تمام دوسرے محاسن سے پوری پوری مناسبت رکھتا ہو' ورنہ زیور کی تو یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پری چہرہ خاتون کو انگریزی لباس پہنا کر گلے میں سیر سوا سیر کی ہندوستانی ہیکل باندھ دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے حفیظ کی شاعری کے متعلق موضوعِ کلام نفسِ مضمون طرزِ سخن اور وزن کی باہمی مناسبت کو اس قدر اہمیّت دی ہے۔ کاش یہ لوگ بھی زیور کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے پہلے ان شعری محاسن کی فکر کرتے جو حفیظ کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ اس صورت میں ایک طرف تو اُردو ادب اور اُردو شاعری کے سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ ہوتا اور دوسری جانب اُن کا سارا کھیل "خوش گلو ایکٹروں اور فوق البھڑک سین سینری" کے باوجود اس طرح ناکام نہ رہتا۔

مخالفوں کی آنکھوں پر تو خیر تعصّب کی پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن

افسوس یہ ہے کہ بعض مبتدی مدّاح بھی اس رَو میں بہ گئے۔ کہنے کو تو یہ حضرات حفیظ صاحب کا تتبع کر کے بزعمِ خود اُردو ادب اور اُردو شاعری کی خدمت میں مصروف تھے۔ مگر یہ سمجھنے کی زحمت انھوں نے بھی گوارا نہ فرمائی کہ صرف ؎

ٹپ ٹپ ٹپاٹپ

مینہ موسلا دھار

کہہ دینے سے بارش کا سماں نہیں بندھ سکتا۔ بلکہ برسات کی فضا پیدا کرنے کے لئے ترنم کے علاوہ بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے اور جب تک وہ چیزیں موجود نہ ہوں ترنم محض "تا نا ری ری" کا بے ہنگم سا ہنگامہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس قدر توجہ انہوں نے مترنم ہندستانی بحروں والی نظموں پر مبذول کی اگر اس کا عشر عشیر بھی دوسری نظموں مثلاً "فرصت کی تلاش" "آزاد وادی" "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملّاح" "درۂ خیبر" "چاندنی میں کشتی" "شامِ رنگیں" وغیرہ پر صرف کرتے بلکہ خود مترنم بحروں والی نظموں ہی کو گویّے کے بجائے شاعر کی آنکھوں سے دیکھتے تو ان پر حفیظ کی شاعری کے تمام محاسن اور حفیظ کی کامیابی کا حقیقی راز بہت جلد

کھل جاتا ہے۔

اس مقصد کے لئے حفیظ کی غزلوں کا مطالعہ خاص طور پر کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن تتبع کرنے والے اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے "ہفت پیکر" حفیظ کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے مقدمہ میں سیّد امتیاز علی صاحب تاؔج لکھتے ہیں :-

"جو لوگ حضرتِ حفیظ کو بحیثیت شاعر جانتے ہیں اگر اُن سے کہا بھی جائے کہ حفیظ کے افسانے ان کی شاعری سے کم قابلِ قدر نہیں تو فی الحال کوئی اس پر غور کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ لوگ حفیظ کی شاعری سے اس قدر متاثر ہو چکے ہیں کہ اب انہیں کسی دوسری حیثیت میں دیکھ کر داد دینے کی مطلق گنجائش نہیں رہی .... ہمیشہ یوں ہی ہوتا آیا ہے دُنیا صرف ایک ہی حیثیت سے کسی کو غیر معمولی داد دیا کرتی ہے۔ ایک وقت میں دو حیثیتوں سے اعترافِ کمال کرنا اس کی بساط سے باہر ہے"۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ دُنیا کا حوصلہ اس سے بھی زیادہ تنگ ہے۔

وہ شاعری میں بھی مختلف اصنافِ سخن کے متعلق حفیظ کے کمال کا اعتراف کرنے سے قاصر رہی ہے۔ مثلاً غزل ہی کو لیجئے "یارانِ نکتہ داں" کے نزدیک غزل گوئی میں حفیظ کا مرتبہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن لوگ ان کی نظموں (بلکہ صرف مترنم بحور والی نظموں) سے اسقدر متاثر ہو چکے ہیں کہ ان کو اب تک ان محاسن کا احساس ہی نہیں ہوا جن کی بنا پر ماہرینِ فن حفیظ کو غزل میں بھی "صاحبِ طرز" تسلیم کرتے ہیں ؎

اسی طرح اگر ان نظموں کو دیکھیں جو حفیظ نے بچّوں کے لئے لکھی ہیں۔ تو شاعری کی اس صنف میں بھی حفیظ مخترع نظر آئیگا۔ خصوصاً جو نظمیں صغیر السّن بچوں کے لئے ہیں۔ ان میں تو شاعر نے کمالِ اختراع کا حیرت انگیز ثبوت دیا ہے۔ لیکن دنیا کو یہاں بھی اعتراف کمال کی توفیق نہیں ہوئی ؎

میں مثالیں دے دے کر حفیظ کی امتیازی خصوصیات اور عام محاسن شعری پر تفصیلی بحث سے احتراز کرتا ہوں۔ ان کے متعلق پروفیسر تاثیر اور دیگر حضرات تھوڑا بہت لکھ چکے ہیں اور انشاء اللہ آیندہ بہت کچھ لکھا جائے گا۔ مزید براں یہ دیباچہ مجمل اشاروں ہی میں کافی طویل ہو گیا ہے۔ لیکن جو لوگ حفیظ کے کلام کا بغرض استفادہ

مطالعہ کرنا چاہیں ان کی خدمت میں گذارش ہے کہ صرف کسی خاص صنف میں شاعر کے نمونۂ کمال اور اس نمونہ کی بھی صرف ایک آدھ خوبی سے متاثر ہو کر اسی کے نہ ہو رہیں بلکہ جن اصنافِ سخن میں حفیظ نے طبع آزمائی کی ہے ان سب کے مختلف نمونوں کا بہ نظرِ امعان مطالعہ کریں۔ ہر نظم اور ہر غزل میں ان کو وہ تمام شعری لوازم نظر آئیں گے جن کے متناسب مجموعہ کا نام شعریت ہے۔ ان لوازم کے ساتھ ان کو اس تناسب کا خیال بھی رکھنا چاہئے جس کے باعث حفیظ اور شعریت گویا مترادف بن گئے ہیں۔ حفیظ کی کامیابی کا راز یہی شعریت ہے۔ جو ترنم کی خانہ زاد نہیں بلکہ خالق ہے +

اختر

”کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا“

مدینے کے مسافر

فسوں باطل ہوا شب کے طلسماتی نظاروں کا
سحر کے جاگتے ہی لد گیا ڈیرا ستاروں کا
بیاباں کے عظیم الشّان منظر سے اُٹھے پردے
کہ جیسے دل میں کوئی اک نظر سے معرفت بھر دے
ہوائے سرد کے آزاد جھونکے سرسراتے ہیں
چمک اٹھنے کی اُمیّدوں میں ذرّے مُسکراتے ہیں
یہ جنّت کا سماں بس اک دو ساعت رہنے والا ہے
کہ صحرا پھر وہی شدّت کی حدّت سہنے والا ہے

یہاں اب ایک ساعت بیٹھنا بھی جان کھونا ہے
طلوعِ مہر سے پہلے ہی پہلے کوچ ہونا ہے
ہوا کی گرمیاں جب ریت کے طوفاں اُٹھاتی ہیں
بیاباں گرد ٹیلوں کی نئی دُنیا بساتی ہیں
چلے جب دشت میں بادِ سموم اِک قہر ہے گویا
یہ اُونٹوں اور انسانوں کے حق میں زہر ہے گویا

اُٹھو آسودگانِ دشتِ غربت خوابِ غفلت سے
کرو تجدید پیمانِ وفا عزمِ زیارت سے
مبادا دن نکل آئے۔ مبادا دُھوپ چڑھ جائے
یہاں بیٹھے رہیں ہم۔ قافلہ کچھ اور بڑھ جائے
انہی ذرّوں کی چھاتی سے کرن سُورج کی پُھوٹیگی
جو پیچھے رہ گئے ہیں اُن پہ بجلی بن کے ٹوٹے گی

دُعا مانگو بیاباں میں کوئی تنہا نہ رہ جائے
مسافر کو خدا اس دھوپ کی سختی نہ دکھلائے

یہ وہ منزل ہے کوسوں تک یہاں پانی نہیں ملتا
بسا اوقات رستہ بھی بآسانی نہیں ملتا

اُٹھو کیا سوچ ہے کیوں عازمِ منزل نہیں ہوتے؟
مدینے کے مسافر اس قدر کاہل نہیں ہوتے

مدینے تک پہنچ جاؤ تو پھر راحت ہی راحت ہے
یہ دُنیا ایک صحرا ہے مدینہ باغِ جنّت ہے

راوی میں کشتی

بن گیا ہے آسماں نِتھرے ہوئے پانی کی جھیل
یا کسی ساحر نے ساکن کر دیا دریائے نیل
کوئی لہر اٹھتی نہیں اس بحرِ حیرت جوش میں
بزمِ انجم غرق ہے موسیقیٔ خاموش میں
کس قدر یہ نیلگوں وسعت سکوت انگیز ہے
جس کے اندر چاند کا چہرہ تجلّی ریز ہے
رات کے افسوں میں گم ہو گئی ہے کائنات
یہ گماں ہوتا ہے شاید سو گئی ہے کائنات

شہ درے کے "نوحہ خواں" مینار بھی خاموش ہیں
مقبرہ بھی، باغ بھی، اشجار بھی خاموش ہیں
اِس طرف سائے کو لپٹائے ہے پُل سویا ہُوا
چاندنی پر ریت کا ہے جُزو وکُل سویا ہُوا
اُس طرف اُجڑی ہوئی بارہ دری خاموش ہے
اِک گئے گزرے پُرانے خواب میں مدہوش ہے
اوڑھ کر مغموم بیوہ کی طرح چادر سفید
کروٹیں لیتی ہے راوی ناشکیب و نا امید
سینہ جُنباں ہے کہ دل میں ہلکا ہلکا درد ہے
اور ہوا کیا ہے لبِ راوی پہ آہِ سرد ہے
نغمہ سویا بربطِ آبِ رواں کی گود میں
جس طرح اک طفل سو جاتا ہے ماں کی گود میں

چاند بالائے فلک ہے، چاند زیرِ آب ہے
چاند ہی ساکن ہے لیکن چاند ہی بیتاب ہے

چاند کو گھیرے میں لے کر بہ رہی ہے چاندنی
کوئی خواب آور کہانی کہہ رہی ہے چاندنی

اور اِس چاندی کے دھارے پر بہا جاتا ہوں میں
خواب کے عالم میں سب کچھ دیکھتا جاتا ہوں میں

یہ مری کشتی بھی گویا خواب کا آغوش ہے
مَیں کسی عالم میں بیٹھا ہوں بس اتنا ہوش ہے

دو طرف خاموش اور تاریک ساحل ہیں رواں
اس روانی پر روانی کا نہیں ہوتا گماں

چُپکے چُپکے دوسری جانب چلے جاتے ہیں یہ
میری کشتی کے جلو میں کیوں نہیں آتے ہیں یہ

مَیں کہاں جاتا ہوں۔ شاید یہ نہیں معلُوم اِنہیں
آنکھ سے فطرت نے رکھّا ہے مگر محروم اِنہیں

دُور اُفق پر اِک نیا منظر ہے میرے سامنے
زندگانی کا رُخِ انور ہے میرے سامنے

مَیں وہاں جاتا ہُوں نیندیں ٹُوٹ جاتی ہیں جہاں
حسرتیں اُمّید کے جلوے دکھاتی ہیں جہاں

شامِ رنگیں

پچھم کے در پہ سورج بستر جما رہا ہے
رنگین بادلے میں چہرہ چھپا رہا ہے
کرنوں نے رنگ ڈالا بادل کی دھاریوں کو
پھیلا دیا فلک پر گوٹے کناریوں کو
عکسِ شفق نے کی ہے اس طرح زرفشانی
گھل مل کے بہہ رہے ہیں ندی میں آگ پانی
اوڑھے سیہ دوپٹے سر سبز وادیوں نے
زیور اتار ڈالے گلزار زادیوں نے

چھایا ہے تھوڑا تھوڑا پیڑوں تلے اندھیرا

چڑیوں نے دیکھتے ہی ڈھونڈا لیے ہیں بسیرا

کلیوں کے قہقہوں سے معمور ہیں ہوائیں

پریوں کی لوریاں ہیں یہ رس بھری صدائیں

لپٹی ہوئی ہیں نیندیں کیف آفریں ہوائیں

خاموشیوں کی لہریں اُٹھنے لگیں فضا میں

گُم ہو چلی ہے دُنیا بکھرے ہوئے سکوں میں

دِن غرق ہو رہا ہے "چُپ چاپ" کے فسُوں میں

کھیتوں میں کام کرکے لَوٹے ہیں کام والے

چادر سروں پہ ڈالے، کندھوں پہ ہل سنبھالے

اب شام آگئی ہے جاگے ہیں بھاگ انکے

ہر سمت گونجتے ہیں رستوں پہ راگ انکے

لے لے کے ڈھور ڈنگر چرواہے آرہے ہیں
سیٹی بجا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

کمسن سہیلیوں کا پنگھٹ پہ جمگھٹا ہے
جانے اکیلیوں کا دن کس طرح کٹا ہے

یہ بار بار باتیں۔ یہ بار بار ہنسنا
یہ بے شمار باتیں۔ یہ بے شمار ہنسنا

اِک گدگدا رہی ہے۔ اِک کھلکھلا رہی ہے
اِک بھر چکی ہے پانی۔ گاگر اُٹھا رہی ہے

شرما کے اِک نے اوڑھے مُنہ پر ہنسی کے مارے
رنگین اوڑھنی کے بھیگے ہوئے کنارے

شرم و حیا کی سُرخی چہرے پہ چھا رہی ہے
شام اس کو دیکھتی ہے اور مُسکرا رہی ہے

چناب

وہ بلندی جس پہ ہیں نورانیوں کی بستیاں
برف کی آبادیاں برفانیوں کی بستیاں
نغمے سوتے ہیں جہاں خاموشیوں کے ساز میں
محو تھا میں بھی وہاں اک روز خوابِ ناز میں
دفعتہً ٹوٹا مرے مجبور خوابوں کا طلسم
بن گئی ہستی مری یکسر ربابوں کا طلسم
گرمیٔ رفتار نے چھیڑا مجھے مضراب سے
گونج اُٹھے کہسار میرے نغمۂ بیتاب سے
مَیں اُتر آیا فرازِ کوہ سے گاتا ہُوا
اپنی متوالی روِش میں ٹھوکریں کھاتا ہُوا

پاسبانوں نے بہت گھیرا بہت روکا مجھے
یعنی ہیبت ناک دیووں نے عبث ٹوکا مجھے

کچھ نہ بن آیا مری سعیِ عمل کے سامنے
میری رو میں بہ گئے آئے جو مجھ کو تھامنے

ابر نے آنسو بہا کر مجھکو رخصت کر دیا!
اور اپنے موتیوں سے میرا دامن بھر دیا

دولت کہسار لے کر دامنِ سیلاب میں
آخرِ کار آ بسا میں خطۂ پنجاب میں

مدتیں گزری ہیں اس فردوس میں بستا ہوں میں
یہ پری زادوں کی وادی ہے یہاں بہتا ہوں میں

اِس زمیں پر چاہنے والے مرے آباد ہیں
شاد ہیں دونوں کنارے ہر طرح سے شاد ہیں

اِن کے دل روشن ہیں سچّی دوستی کی آگ سے
ان کے گیتوں کی صدا ملتی ہے میرے راگ سے
میرا افسانہ بندھا ہے ان کے افسانوں کے ساتھ
آہ جیسے شمع وابستہ ہو پروانوں کے ساتھ
حُسن و صورت عشق و اُلفت کا نہیں کال اس جگہ
ہر طرف آباد ہیں سوہنی مہینوال اس جگہ
ڈوبتے ہیں میری موجوں پر کئی کچّے گھڑے
روز دکھلاتے ہیں اک اُلفت نئی کچّے گھڑے
یہ ہوا لہروں سے جو محوِ شکست و بست ہے
ہر نئے رانجھے کی میٹھی بانسری سے مست ہے،
ہر دوشیزہ دیکھتی ہے مجھ میں نقشہ ہیر کا
بن گیا ہُوں آئنہ مَیں ہیر کی تصویر کا

گھیرتی ہیں مجھ کو ان سادہ دلوں کی ٹولیاں
بھولی بھولی صورتیں ہیں میٹھی میٹھی بولیاں

اپنے بچّوں کی طرح سے پالتا ہوں مَیں اِنہیں
جو طلب کرتے ہیں یہ۔ دے ڈالتا ہوں مَیں انہیں

میرے بچّوں کی طرح آتے ہیں میری گود میں
کھیلتے ہیں اور سو جاتے ہیں میری گود میں

ان کو طوفانِ حوادث سے بچا لیتا ہوں مَیں
اپنے دامانِ محبت میں چھپا لیتا ہوں مَیں

مختصر یہ ہے کہ اُلفت ہے مجھے پنجاب سے
خوش ہوں مَیں پنجابیوں کی شورشِ بیتاب سے

ہمالیہ

یہ دُنیا اللہ اللہ کس قدر آزاد دُنیا ہے
یہی دُنیا ہے جس کے فیض سے آباد دُنیا ہے
یہ اُونچی چوٹیاں نورانیوں کی بارگاہیں ہیں
یہ تودے برف کے برفانیوں کی کارگاہیں ہیں
یہ منزل ہے ہوا کے برشگالی کاروانوں کی
یہیں پر ختم ہوتی ہے بلندی آسمانوں کی
کوئی خاکی قدم اس خاک پر آیا نہیں اب تک
فرشتوں کی عبادت گاہ ہے یہ سرزمیں اب تک
یہاں آکر زمین نے آسماں کی ہمسری کر لی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کر لی
یہ اُونچے شامیانے دستِ قدرت نے لگائے ہیں
یہ لاتعداد خیمے سبز مخمل سے سجائے ہیں

یہ دیوداروں کا جنگل قدرتی پریوں کی بستی ہے
یہاں خاموشیاں اُگتی ہیں موسیقی برستی ہے
یہاں پگھلی ہوئی چاندی کے فوّارے اچھلتے ہیں
یہاں سونے نکلتے ہیں یہاں چشمے اُبلتے ہیں
یہاں آکر ہوائیں دامنوں میں رنگ بھرتی ہیں
گھٹائیں بن کے اٹھتی ہیں فلک سے جنگ کرتی ہیں
کوئی دیکھے یہاں آکر تبسّم لالہ زاروں کے
ترنّم جوئباروں کے تکلّم آبشاروں کے
یہ شادابی خزاں ناآشنا معلوم ہوتی ہے
شگفتہ ہر طرف شانِ خدا معلوم ہوتی ہے
یہاں چاروں طرف خاموشیوں کا حشر برپا ہے
جہاں تک دیکھئے بس ایک نورانی اندھیرا ہے
حفیظ آکر یہاں میں اپنی ہستی بھول جاتا ہوں
خدا کی قدرتوں میں خودپرستی بھول جاتا ہوں

صبح و شامِ کوہسار

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوتِ کوہسار
کارپردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروفِ کار
رفعتوں پر رفعتیں ہیں پستیوں میں پستیاں
کس قدر آباد ہیں بے فانیوں کی بستیاں
اِک بڑے قانون کی تعمیل ہوتی ہے یہاں
قسمتِ آب و ہوا تبدیل ہوتی ہے یہاں
گوشے گوشے میں ہیں قائم کارخانے ابر کے
بن رہے ہیں تن رہے ہیں شامیانے ابر کے
وقت بیچارہ یہاں پابند ہے مجبور ہے
اس مشقت گاہ کا ادنےٰ سا اِک مزدور ہے

آسماں گردش میں ہے دو کام کرنے کے لئے
صبح کرنے کے لئے یا شام کرنے کے لئے

صبح

صبح کا یہ فرض ہے معمول پر آیا کرے
جس قدر سونا فراہم کر سکے لایا کرے
لے کے آتی ہے زرِ خالص کی کانیں ہر سحر
لا کے رکھ دیتی ہے سونے کی چٹانیں شرق پر
کیمیا سازانِ چرخ اُٹھتے ہیں اپنے کام کو
آگ کی بھٹی میں رکھتے ہیں طلائے خام کو
دفعتاً شعلے نظر آتے ہیں یا رنگیں دھُواں
چوٹیاں مشرق کی ہو جاتی ہیں سب آتش فشاں
دیکھتے ہی دیکھتے ہوتا ہے سونے کا یہ حال
کوئی شے پگھلی ہوئی کچھ قرمزی کچھ لال لال

حکم یہ ہے اس میں جو ناقص ہے چھن جایا کرے
اور باقی اک طلسمی گیند بن جایا کرے

بعض چابک دست شاگردانِ اُستادِ ازل
کرتے ہیں اس گیند میں نیرنگ بھرنے کا عمل

جب پہاڑوں سے اُبھرتا ہے یہ بقعہ نور کا
حُسن خود کرتا ہے نظارہ قریب و دُور کا

کارگہ کا جائزہ لیتے ہیں اُٹھ کر نوریاف
ذرّے ذرّے پر چڑھا دیتے ہیں نُورانی غلاف

یہ طلسمی گیند برساتی ہے نار آمیز نور
زندگی کی گرم بازاری کا ہوتا ہے ظہور

شام

رفتہ رفتہ سُرخیوں پر چھا گیا کالا غبار
مٹ گیا رنگِ شفق مُرجھا گیا یہ لالہ زار

نور کے زرّین ایوانوں میں تالے پڑ گئے
ارغوانی بدلیوں کے رنگ کالے پڑ گئے
شام آئی خامشی کا جال پھیلائے ہوئے
ساحرہ بیٹھی ہے کالے بال بکھرائے ہوئے
بے زباں خاموشیاں جاگیں صدائیں سو گئیں
شورشیں چپ ہو گئیں خاموشیوں میں کھو گئیں
کوہ پر ظلمات کی پریوں نے پر پھیلا دئیے
ہر طرف تاریک دامن کھول کر پھیلا دئیے
ایک پُر اسرار خاموشی فضا میں بس گئی
اک سبک رفتار مدہوشی ہوا میں بس گئی
جھاڑیاں کالی ردائیں اوڑھ کر چپ ہو گئیں
بند کلیاں اپنی خوشبو سے لپٹ کر سو گئیں
اس طرح اونچے پہاڑوں میں گھری ہیں وادیاں
جس طرح دیووں کے گھر میں قید ہوں شہزادیاں

منظرِ کہسار پر اس دم یہ ہوتا ہے گماں
اونٹ ہیں بیٹھے ہوئے اترا ہوا ہے کارواں
یا گھٹائیں ہیں کہ اٹھیں سرد ہو کر جم گئیں
اور یا پھر آندھیاں ہیں چلتے چلتے تھم گئیں
یا کنارِ چرخ ظاہر ہیں اثر برسات کے
خیمۂ بوسیدہ میں پیوند ہیں بانات کے

شہسوارِ کربلا

لباس ہے پھٹا ہُوا غبار میں اَٹا ہُوا
تمام جسمِ نازنیں چھدا ہُوا کٹا ہُوا
یہ کون ذی وقار ہے بلا کا شہسوار ہے
کہ ہے ہزار قاتلوں کے سامنے ڈٹا ہُوا
یہ بالیقیں حسینؓ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

یہ جس کی ایک ضرب سے کمالِ فنِ حرب سے
کئی شقی گرے ہوئے تڑپ رہے ہیں کرب سے
غضب ہے تیغۂ دوسر کہ ایک ایک وار پر
اُٹھی صدائے الاماں زبانِ شرق و غرب سے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے
یہ کون حق پرست ہے مئے رضا سے مست ہے
کہ جس کے سامنے کوئی بلند ہے نہ پست ہے
اُدھر ہزار گھات ہے مگر عجیب بات ہے
کہ ایک سے ہزار ہا کا حوصلہ شکست ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

عبا بھی تار تار ہے   تو جسم بھی فگار ہے
زمیں بھی ہے تپی ہوئی   فلک بھی شعلہ بار ہے
مگر یہ مردِ تیغ زن   یہ صف شکن فلک فگن
کمالِ صبر و تن وہی سے محوِ کارزار ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

دلاوری میں فرد ہے   بڑا ہی شیر مرد ہے
کہ جس کے دبدبے سے دشمنوں کا رنگ زرد ہے
حبیبِ مصطفٰیؐ ہے یہ   مجاہدِ خدا ہے یہ
جبھی تو اس کے سامنے یہ فوج گرد برد ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نورِ عین ہے

اُدھر سپاہِ شام ہے ہزار انتظام ہے
اُدھر ہیں دشمنانِ دیں اِدھر فقط امام ہے
مگر عجیب شان ہے غضب کی آن بان ہے
کہ جس طرف اُٹھی ہے تیغ بس خُدا کا نام ہے
یہ بالیقیں حسینؑ ہے
نبیؐ کا نُورِ عین ہے

لاہور

(تصویر کا ایک رُخ)

خطۂ لاہور یعنی جنّتِ ہندوستاں
جس کی خوبی سے ہے خاکِ پاکِ پنجاب آسماں
ہے تو یہ جنّت مگر انسان بستے ہیں یہاں
خُلد کے نکلے ہوئے ارمان بستے ہیں یہاں
صورت و معنی بہم محوِ نیاز و ناز ہیں
حسن کے پہلو بہ پہلو عشق کے انداز ہیں
حُسن پھرتا ہے یہاں اٹھکھیلیاں کرتا ہوُا
سادگی کو بے حجابی سے عیاں کرتا ہوُا
عشق ہر سُو اس تماشا گاہ میں آوارہ ہے
زخم خوردہ ہے۔ بہت آزردہ ہے۔ بیچارہ ہے

اِک طرف قاتل نگاہیں تیر برساتی ہوئی
اِک طرف مجبور آہیں دل کو دھڑکاتی ہوئی

یہ وہ میخانہ ہے جس میں ساقیانِ مے فروش
پھر رہے ہیں ہر طرف ساغر بکف مینا بدوش

چند رِندانِ بلا نوش آتے ہوئے جاتے ہوئے
گنگناتے لڑکھڑاتے ٹھوکریں کھاتے ہوئے

ولولے اُٹھتے ہوئے بڑھتے ہوئے چڑھتے ہوئے
ردِّ آفات و بلا کی سیفیاں پڑھتے ہوئے

جلوہ آرا ہیں یہاں کیفیّتیں پنجاب کی
سینۂ فولاد میں خاصیّتیں سیماب کی

آب و گل میں زندگی ہنگامہ آرا ہے یہاں
موت بھی چاہے تو جینے کا سہارا ہے یہاں

توبہ نامہ

اُف وُہ راوی کا کنارہ۔ وہ گھٹا چھائی ہوئی
شام کے دامن میں سبزے پر بہار آئی ہوئی
وہ شفق کے بادلوں میں نیلگوں سُرخی کا رنگ
اور راوی کی طلائی نقرئی لہروں میں جنگ
شہ درے میں آم کے پیڑوں پہ کوئل کی پکار
ڈالیوں پر سبز پتّوں سُرخ پھولوں کا نکھار
وہ گلابی عکس میں ڈوبی ہوئی چشمِ حباب
اور نشے میں مست وہ سرمست موجوں کے رباب
وہ ہوا کے سرد جھونکے شوخیاں کرتے ہوئے
ان پہ بدمست کر دینے کا دم بھرتے ہوئے

دُور سے ظالم پپیہے کی صدا آتی ہُوئی
پے بہ پے کم بخت پی پی کہہ کے اُکساتی ہُوئی
اَور وہ مَیں ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہُوا
دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر بیٹھا ہُوا
شیخ صاحب! سچ تو یہ ہے اُن دِنوں پیتا تھا مَیں
اُن دِنوں پیتا تھا یعنی جِن دِنوں جیتا تھا مَیں
اب وہ عالم ہی کہاں ہے مَے پیئے مدّت ہوئی
اب مَیں توبہ کیا کروں۔ توبہ کئے مدّت ہوئی

گیت

کیا پابندِ نَے نالے کو میں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجادِ میری

جاگ سوزِ عشق

جاگ سوزِ عشق جاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ کام دیوتا　　فتنہ ہائے نَو جگا!
بُجھ گیا ہے دِل مرا　　پھر کوئی لگن لگا۔
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

پڑگئی دِلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑگیا
پرتھوی پہ چار کونٹ ایک سوگ پڑگیا
سرنگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو نے آنکھ بند کی کائنات سوگئی
حسنِ خود پسند کی دن سے رات ہوگئی
زرد پڑگیا سہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر — رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر — دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

اے مغنّئ شباب — جاگ خوابِ ناز سے
دِل شکستہ ہے رباب — عرصۂ دراز سے
مر گئے قدیم راگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے
ہر اُمنگ جاگ اُٹھے
آہ و نالہ جاگ اُٹھے
راگ رنگ جاگ اُٹھے

جوگ سے ملے بہاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پھر اُسی اُٹھان سے
تیر اُٹھے کماں اُٹھے
صبر کی زبان سے
شورِ الاماں اُٹھے

جاگ اُٹھیں دلوں کے بھاگ
جاگ سوزِ عشق جاگ!

جاگ سوزِ عشق جاگ

جاگ اے نظر فروز! جاگ اے نظر نواز!
جاگ اے زمانہ سوز! جاگ اے زمانہ ساز!
جاگ نیند کو تیاگ!
جاگ سوزِ عشق جاگ!

کرشن بنسری

بنسری بجائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
پریت میں بسی ہوئی اداؤں سے
گیت میں بسی ہوئی صداؤں سے
برج باسیوں کے جھونپڑے بسائے جا
سُنائے جا سُنائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا

بنسری بجائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا
بنسری کی لے نہیں ہے آگ ہے
اور کوئی شے نہیں ہے آگ ہے
پریم کی یہ آگ چار سو لگائے جا
جلائے جا جلائے جا
کاہن مُرلی والے نند کے لال
بنسری بجائے جا
بنسری بجائے جا

دِل ہے پرائے بَس میں

(۱)

پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں
پورب میں جاگا ہے سویرا دُور ہوا دُنیا کا اندھیرا
لیکن گھر تاریک ہے میرا
پچھّم میں جاگی ہیں گھٹائیں پھرتی ہیں سرمست ہوائیں
جاگ اُٹھو میخانے والو پینے اور پلانے والو
زہر ملاؤ رس میں
دل ہے پرائے بس میں

(۲)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

باغ میں بلبل بول رہی ہے نرگس آنکھیں کھول رہی ہے

شبنم موتی رول رہی ہے

آم پہ کوئل کوک اٹھی ہے سینے میں اک ہوک اٹھی ہے

بن جاؤں نہ کہیں سودائی جانوروں کی رام دہائی

چُبھتی ہے نس نس میں

دل ہے پرائے بس میں

(۳۳)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

بیت گیا دن رات بھی آئی　　تاروں نے محفل بھی سجائی
اُس نے مگر صورت نہ دکھائی

وہم کئی ٹالے ہیں میں نے　　تارے گن ڈالے ہیں میں نے
وعدے کا تو کس کو نہیں ہے　　آنکھ میں لیکن نیند نہیں ہے
نیند نے کھالیں قسمیں

دِل ہے پرائے بس میں

(۴)

پرائے بس میں

دل ہے پرائے بس میں

کیوں کرتے ہو دنیا داری   جان گیا اُلفت میں تمہاری

تہ کر دو یہ نصیحت ساری

مجھ کو تم سے کام ہی کیا ہے؟   میرا ننگ و نام ہی کیا ہے؟

اِس دُنیا کی پریت یہی ہے   رسم یہی ہے ریت یہی ہے

ٹوٹ گئیں سب رسمیں

دل ہے پرائے بس میں

(۵)

پرائے بس میں

دِل ہے پرائے بس میں

کون بتائے اُلفت کیا ہے   دل کیا دل کی حقیقت کیا ہے

مر مٹنے میں لذّت کیا ہے

بے درد اس کو کیا پہچانے   جس پر بیتی ہو وہ جانے

دیکھ اے گیانی دُنیا ہے فانی   ہائے محبّت۔ ہائے جوانی

آگ لگی ہے خَس میں

دل ہے پرائے بس میں!

(۶)

پرائے بس میں

دِل ہے پرائے بس میں

دوستو اس کا نام نہ پوچھو کچھ بھی نہیں ہے کام نہ پوچھو
اس کے سوا پیغام نہ پوچھو

میرا ابھی تم نام نہ لینا مِل جائے تو یوں کہہ دینا
اِک دیوانہ چُپ رہتا ہے کہتا ہے تو یہ کہتا ہے

دل ہے پرائے بس میں
دل ہے پرائے بس میں

پُرانی بسنت

(۱)

رنگ دے ——————— رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے قدیم رنگ بے دریغ ۔ بے درنگ

جس کی ضَو سے مات ہو رنگ بازئ فرنگ

عشق کے لباس کو

رنگ شوخ و شنگ دے

رنگ دے ——————— رنگ دے قدیم رنگ

(۲)

رنگ دے ——— رنگ دے قدیم رنگ

ایک ہی اُمنگ دے　　ایک ہی ترنگ دے
دین۔دھرم مٹ نہ جائے　　پاسِ نام و ننگ دے
دامنِ دراز دے
یا قبائے تنگ دے

رنگ دے ——— رنگ دے قدیم رنگ

(۳)

رنگ دے ——— رنگ دے قدیم رنگ

عمر گھٹ گئی تو کیا؟　　ڈور کٹ گئی تو کیا؟
یہ ہوائے تند و تیز　　رُخ پلٹ گئی تو کیا؟
آگئی بسنت رُت
اور اک پتنگ دے

رنگ دے ——— رنگ دے قدیم رنگ دے

(۴)

رنگ دے ـــــــــــــ رنگ دے قدیم رنگ

صلح ہو کہ جنگ ہو　　ساتھیوں کا سنگ ہو

سب ہمیں پسند ہے　　خون ہو کہ رنگ ہو

خُون ہو کہ رنگ ہو

ایک رنگ رنگ دے

رنگ دے ـــــــــــــ رنگ دے قدیم رنگ

پریت کا گیت

اپنے من میں پریت
بسالے
اپنے من میں پریت

من مندر میں پریت بسالے — او مورکھ او بھولے بھالے
دل کی دُنیا کر لے روشن — اپنے گھر میں جوت جگالے
پریت ہے تیری ریت پرانی — بھول گیا او بھارت والے

بھُول گیا او بھارت والے
پریت ہے تیری ریت
بسالے
اپنے من میں پریت

(۲)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

کرودھ کپٹ کا اُترا ڈیرا　　چھایا چاروں کونٹ اندھیرا
شیخ برہمن دونوں رہزن　　ایک سے بڑھ کر ایک لٹیرا
ظاہر داروں کی سنگت میں　　کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

کوئی نہیں ہے سنگی تیرا

من ہے تیرا میت

بسا لے

اپنے من میں پریت

(۳)

اپنے من میں پریت

بسا لے

اپنے من میں پریت

بھارت ماتا ہے دُکھیاری — دُکھیارے ہیں سب نر ناری

تو ہی اُٹھا لے سُندر مُرلی — تو ہی بن جا شام مراری

تو جاگے تو دُنیا جاگے — جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

جاگ اُٹھیں سب پریم پجاری

گائیں تیرے گیت

بسا لے

اپنے من میں پریت

(۴)

اپنے من میں پریت
بسا لے

اپنے من میں پریت

نفرت اِک آزار ہے پیارے ‏ دُکھ کا دارو پیار ہے پیارے
آجا اصلی رُوپ میں آجا ‏ تُو ہی پریم اَوتار ہے پیارے
یہ ہارا تو سب کچھ ہارا ‏ من کے ہارے ہار ہے پیارے

من کے ہارے ہار ہے پیارے
من کے جیتے جیت
بسا لے

اپنے من میں پریت

(۵)

اپنے من میں پریت

بسالے

اپنے من میں پریت

دیکھ بڑوں کی ریت نہ جائے — سمر جائے پر پریت نہ جائے

مَیں ڈرتا ہوں کوئی تیری — جیتی بازی جیت نہ جائے

جو کرنا ہے جلدی کرلے — تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے

وقت نہ جائے بیت

بسالے

اپنے من میں پریت

فرشتہ کا گیت

(۱)

دیکھ اُس دُنیا کا نظّارا
میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں
نیندوں کے دریاؤں میں ہے ایک حبابی دُنیا   اس دُنیا کو دُنیا کہہ دیتی ہے خوابی دُنیا
دیکھ اس دُنیا کا نظارا
ہلکا ہلکا پیارا پیارا
میرے ساز کے تاروں میں   رنگیں نغمہ زاروں میں

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا

سپنا کیا ہے میٹھی پریت — میٹھی پریت ہے میرا گیت
میرے میٹھے گیتوں میں بستی ہے ساری ہستی — میٹھے میٹھے گیت ہیں میرے پیاری پیاری ہستی

ہستی کیا ہے میٹھا سپنا
دل میں رہنا۔ آنکھ سے چھپنا

سپنا کیا ہے میٹھی پریت — میٹھی پریت ہے میرا گیت

اُلفت کا اِظہار

میرے دل کا باغ

پیاری۔ میرے دل کا باغ

مَیں ہوں دل کے باغ کا مالی　　لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

اِن نازک پھول ہیں جیسے اُجلے اور بے داغ　　ایسا ہی بے داغ ہے پیاری میرے دل کا باغ

پیاری میرے دل کا باغ

مَیں ہوں دل کے باغ کا مالی　　لایا ہوں پھولوں کی ڈالی

اُلفت کا احساس

پیاری اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا   خوشبوؤں میں رہنا سہنا

مدّھم ہلکی بھینی بھینی ان پھولوں کی باس   میٹھا میٹھا درد ہو جیسے الفت کا احساس

پیاری اُلفت کا احساس

اُلفت ہے پھولوں کا گہنا   خوشبوؤں میں رہنا سہنا

اُلفت کا اِظہار

پیاری اُلفت کا اِظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں   تیری یہ حیران نگاہیں

اِن پھولوں کی ہر ڈالی ہے اک گلشن مہکار   ان بھنوروں کی رنگت جیسے الفت کا اظہار

پیاری اُلفت کا اظہار

میری ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں   تیری یہ حیران نگاہیں

اندھی جوانی

(گیت)

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں کالی کالی
خوب برسنے والی
متوالی
پرشور
گھٹائیں
چھائی ہیں گھنگھور
گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

گلشن کی گل پوش ادائیں　　آموں کی خاموش فضائیں

کوئل کی مدہوش صدائیں

بَن میں بول رہے ہیں مور

گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور　　گھٹائیں چھائی ہیں گھنگھور

جوانی لے آئی برسات　　جوانی لے آئی برسات

جوانی۔ ہائے جوانی

سرشوری۔ نادانی

مستانی

بدذات

جوانی

لے آئی برسات

جوانی لے آئی برسات

بیٹھا ہوں اب مرگ کنارے کرتا ہوں حوروں کے نظارے

آہ نگاہیں۔ آہ اشارے

چھائی نگہ پر کالی رات

جوانی لے آئی برسات جوانی لے آئی برسات

محبّت آہوں کا طوفان محبّت آہوں کا طوفان

محبّت۔ پیاری پیاری

میٹھی سی بیماری

بے چاری

انجان

محبّت

آہوں کا طوفان

محبّت آہوں کا طوفان

اک کشتی ملاح سے خالی　　میں نے اٹھا طوفان میں ڈالی

اس کشتی کا اللہ والی

پار لگائے گا رحمان

محبت آہوں کا طوفان　　محبت آہوں کا طوفان

حُسن اور موت

ذِلّتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا
ہا و ہو کو لے گیا میدان خالی کر گیا
مر گیا ——— عشق آخر مر گیا
اُٹھ گئی آہ و فغاں
رہ گئے کچھ استخواں

بے بسی
بے کسی

نوحہ خواں ——— زندگی پر نوحہ خواں
مر گیا ——— عشق آخر مر گیا
ذِلّتوں سے تنگ آ کر عشق آخر مر گیا

(۲)

موت نے چاہا کہ تکمیلِ جہاں بانی کرے
یعنی شاہِ حسن کو وقفِ پشیمانی کرے
دیکھ لے ــــــــ حسن آکر دیکھ لے
زندگانی کا مآل
اس جوانی کا مآل
عیش کو
طیش کو
پائمال ــــــــ لن ترانی کا مآل
دیکھ لے ــــــــ حسن آکر دیکھ لے
موت نے چاہا کہ تکمیلِ جہاں بانی کرے

(۳۲)

آرہا تھا حُسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہُوا

آپ ہی اپنی ہوا خواہی کا دم بھرتا ہُوا

بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہُوا

بیش و کم سے بے خبر

زیر و بم سے بے خبر

شاد شاد

بامُراد

بے خبر ——— رنج و غم سے بے خبر

بے حجاب ——— شوخیاں کرتا ہُوا

آرہا تھا حسن بھی اٹھکیلیاں کرتا ہُوا

یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چُپ ہوگئی
شاخِ گل پر بلبلِ رنگیں نوا چُپ ہوگئی
ہوگئی —— ہر صدا چُپ ہوگئی
اور فضا گھبرا گئی
خوف سے تھرا گئی

ہوش پر
جوش پر

چھا گئی —— مُردنی سی چھا گئی
ہوگئی —— ہر صدا چُپ ہوگئی
یہ تماشا دیکھ کر موجِ صبا چُپ ہوگئی

(۵)

آج حسن و موت میں اک معرکہ ہونے کو تھا
کون رہ جائے گا باقی۔ فیصلہ ہونے کو تھا
فیصلہ! —— جانے کیا ہونے کو تھا
دم بخود تھی کائنات
اُڑ گیا رنگِ حیات
تھم گئے
جم گئے
بے ثبات —— سب وجودِ بے ثبات
فیصلہ! —— جانے کیا ہونے کو تھا
آج حسن و موت میں اک معرکہ ہونے کو تھا

(۶)

حسن آیا سرخوشِ کیفِ شرابِ زندگی
موت کی وادی پہ چمکا آفتابِ زندگی
زندگی ——— کامیابِ زندگی

ابتدا سے بے نیاز
مامضےٰ سے بے نیاز

سر بسر

بے خبر

بے نیاز ——— انتہا سے بے نیاز
زندگی ——— کامیابِ زندگی
حسن آیا سرخوشِ کیفِ شرابِ زندگی

(۷)

استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن
خندۂ دلچسپ تھا اندازِ استہزائے حسن
اور بھی ——— مٹ گئے اعدائے حسن
موت حیراں ہو گئی
خود پشیماں ہو گئی

زندگی
خوش ہوئی

ہو گئی ——— بلکہ خنداں ہو گئی
اور بھی ——— مٹ گئے اعدائے حسن
استخوانوں پر پڑی جب چشمِ بے پروائے حسن

(۸)

عشق کے مرنے میں بھی اِک آن پیدا ہوگئی
یعنی مُردہ ہڈیوں میں جانِ پیدا ہوگئی
ہوگئی ——— شان پیدا ہوگئی
شوخیِ انداز تھی
یا نگاہِ ناز تھی!
اُف نگاہ!
بے پناہ!
راز تھی ——— واقعی اِک راز تھی
ہوگئی ——— شان پیدا ہوگئی
عشق کے مرنے میں بھی اِک آن پیدا ہوگئی

کاہل کا گیت

(امریکن شاعرہ ایلا وھیلر ولکاکس کی ایک نظم ہے)

اب شام ہو چلی ہے اب چھا چلا اندھیرا
دُنیا پہ آسماں نے صبر و سکوں بکھیرا

اور دامنِ شفق پر
سُرخی نے رنگ پھیرا

مستور ہیں ہوائیں اس پُر سکوں فضا میں
کچھ میٹھے میٹھے نغمے
کچھ گیت کچھ ترانے

لیکن اُداس ہوں میں بالکل نراس ہوں میں

بے کار ہی گزارا یہ دن پھر آج میں نے
سوچا نہ کام کا کوئی علاج میں نے
اُٹھ کر نہیں سنوارا
کچھ کام کاج میں نے

کھیتوں پہ جانے والے ہمت دکھانے والے
لوٹے ہیں کام کر کے
دامن خوشی سے بھر کے
خوشیاں منا رہے ہیں اور گیت گا رہے ہیں

خوش ہو کے اس طرح سے گاتی نہیں کبھی میں
اس خوشنما خوشی کو پاتی نہیں کبھی میں
اس کیف و سرخوشی میں
آتی نہیں کبھی میں

میری اُداس گھڑیاں — رہتی ہیں سینہ کوباں
سُن سُن کے یہ منادی
اب ہو چکی ہوں عادی
چُپ چاپ سُن رہی ہوں — اور سر کو دُھن رہی ہوں

مغرب کے سُرخ بادل — مُرجھا چکے ہیں سارے
اور شام کی جبیں پر — جھلکے ہوئے ہیں تارے
لیکن میں سرنگوں ہوں
بیٹھی ہوں اِک کنارے
بے تاب ہو رہی ہوں — چُپ چاپ رو رہی ہوں
بے کار زندگی پر
بیمار زندگی پر
سر کو کھپا رہی ہوں — آنسو بہا رہی ہوں

لیکن ہے مدّتوں سے ایسا ہی حال میرا
سب بھول جاؤنگی مَیں آئے گا جب سویرا
پھر کاہلی کا آکر
دِل میں جمے گا ڈیرا
دِن بیت جائے گا پھر یہ وقت آئے گا پھر
خوش ہونگے کام والے
اور مَیں کروں گی نالے
تدبیر سے ڈروں گی تقدیر پر مروں گی

جب صُبح کی ضیائیں ملتی نہیں مسرّت
پھر شام کی روائیں حاصل ہو کیا فراغت
مجھ کو تو ایک پل بھی
ہوتی نہیں یہ جرأت

دِل کو ذرا سنبھالوں　　پھولوں پہ آنکھ ڈالوں

دل ہے مرا فسُردہ

شاید ہوں وہ بھی مُردہ

شاید وہ میرے پیارے　　مُرجھا چکے ہوں سارے

یہ دن یہ میری راتیں　　یہ ماہ و سال میرے

بڑھتے رہے ہمیشہ　　رنج و ملال میرے

ہاں خوشنما بہت ہیں

خواب و خیال میرے

لیکن انہیں اگر مَیں　　تحفے کے طور پر مَیں

اُس در پہ لے کے جاؤں

دربار میں دکھاؤں

تو دو جہاں کا آقا　　مجھ کو نکال دے گا

آقا کے سامنے کیا منہ لے کے جاؤنگی میں
خواب و خیال کیونکر جا کر دکھاؤں گی میں
شرمندہ ہو کے یونہی
بس لوٹ آؤں گی میں
غفلت شعار ہوں میں تقصیر وار ہوں میں
اُس نے اگر یہ پُوچھا
دُنیا سے لائی ہے کیا؟
پھر کیا جواب دوں گی اللہ میں کیا کہوں گی!

راحت پسند ہستی کچھ کام کاج کر لے
ان محنتوں کا خوگر اپنا مزاج کر لے
جو کام کل کرے گی
وُہ اُٹھ کے آج کر لے

اُٹھ کارگاہ میں چل   محنت کی راہ میں چل

اُٹھ وقت جا رہا ہے

تجھ کو بتا رہا ہے

تو عمر کھو رہی ہے   برباد ہو رہی ہے

پستیاں

کیا ہو گئیں وہ عہدِ فراغت کی مستیاں
وہ دوستوں کی بزم وہ بادہ پرستیاں

آخر شکست کھا کے گرا پہلوانِ شوق
افکار کی چلیں وہ زبردست دستیاں

پیاروں کی موت نے مری دُنیا اُجاڑ دی
یاروں نے دُور جا کے بسائی ہیں بستیاں

جن سے خیال میں بھی جُدائی نہ تھی پسند
وہ خواب ہو گئے ہیں خیالوں کی ہستیاں

ٹوٹے پڑے ہیں آج قرابے شراب کے
کیا جلد اُتر گئیں مرے نشّوں کی مستیاں

کب تک اُٹھیں گے بہرِ دعا دستِ التجا
آخر بلند ہو کے رہیں گی یہ پستیاں

چلی ہے جانِ یادِ رفتگاں میں
مُسافر ہے تلاشِ کارواں میں

والدہ کی موت

(۱۹۲۵ء میں جب مصنّف خیرپور سندھ میں تھا)

اے کہ جینا تھا تجھے بھی ناگوار
اے کہ تُو مدّت سے تھی زار و نزار

مل گئی مٹّی میں تُو پایانِ کار
بن گیا ہے آج تیرا بھی مزار

فکر تھی تجھ کو بہت اولاد کی
راہ لی آخر عدم آباد کی

موجہائے اشک میں بہتی رہی
رفتگاں کی یاد میں رہتی رہی

دائمی ماتم کے دُکھ سہتی رہی
جلد مر جاؤں گی یہ کہتی رہی

آج فرصت ہو گئی ہر کام سے
سو لحد میں سو بڑے آرام سے!

میری اولادوں کے تھے ارماں تجھے
اب پڑھانا تھا اُنہیں قرآں تجھے
یوں نہ کرنا تھا اُنہیں حیراں تجھے
بچّیاں روتی ہیں اے امّاں تجھے

آج کیوں اِن سے جُدا سوئی ہے تو؟
دامنِ مادر میں جا سوئی ہے تُو

تُو نے کیں میری بہت غمخواریاں
عمر بھر کرتی رہی دلداریاں
ہائے رے مجبوریاں لاچاریاں
مجھ کو دھوکا دے گئیں ناداریاں

وقتِ آخر مَیں نہیں تجھ سے قریب
وقتِ آخر رہ گیا مَیں بدنصیب

اللہ اللہ کِس قدر مجبور ہُوں
زر نہیں آنے سے بھی معذور ہُوں
کیا کہوں اس وقت بے مقدور ہُوں
آہ تجھ سے کالے کوسوں دُور ہوں

تُو نے بھیجا تھا مجھے پردیس میں
تاکہ آؤں رِزق لے کر دیس میں

آہ وہ حسرت دمِ رخصت تری! وہ تبسّم میں نہاں رقّت تری!
آہ وہ معصوم سی صُورت تری! آہ وہ مغموم سی شفقت تری!
وہ نگہ پر بےکسی چھائی ہُوئی
وہ تری آواز بھرّائی ہوُئی

میرے سر پر ہاتھ رکھنا پیار سے اور یہ کہنا بڑے اصرار سے
"اے پسر بے فکر رہ گھر بار سے کام کیا تجھ کو مرے افکار سے"
تُو نہ رو اچھّی ہوئی جاتی ہوں مَیں
غم نہیں کھاتی دوا کھاتی ہوں مَیں

ہائے آنے میں تذبذب تھا مجھے ہائے آنا ہی نہ تھا زیبا مجھے
خود ہی تُو نے دُودھ جب بخشا مجھے روکتا تھا میرا اندیشہ مجھے
کر دیا بے بس تری تاکید نے
ساتھ ہی والد کی بھی تائید نے

مَیں نے تیرے پاؤں پر بوسہ دیا تُو نے سینے سے مجھے چمٹا لیا
کانپتے لب فی امان اللہ کہا اور مُنہ سر چُوم کر رخصت کیا

راستے سے لَوٹ آیا مَیں مگر
کیونکہ تھی تیری نقاہت پُر خطر

پھر بُرائی کی مری تقدیر نے دی دغا کوتاہیٔ تدبیر نے
کر دیا قائل تری تقریر نے اور کھینچا رزق کی زنجیر نے

حُکم سے تیرے ہُوا لاچار مَیں
پھر سفر پر ہو گیا تیار مَیں

گھر سے مَیں نکلا اُدھر گھر لُٹ گیا مَیں تلاشِ زر میں تھا زر لُٹ گیا
لُٹ گیا بختِ سکندر لُٹ گیا گلشنِ آغوشِ مادر لُٹ گیا

مَیں شکستہ پر چمن سے دُور ہُوں
دُور ہوں خاکِ وطن سے دُور ہُوں

آج مَیں ہُوں اور تنہائی مری ہم نفس ہے خاک صحرائی مری
دم بخود ہے ناشکیبائی مری دل کی دُنیا ہے تماشائی مری

دل ہی میں بیتاب ہو لیتا ہُوں میں
اور چُپکے چُپکے رو لیتا ہوں میں

تیری خدمت کے لئے زندہ تھا مَیں تیری راحت کیلئے زندہ تھا مَیں
اس سعادت کے لئے زندہ تھا میں اس ضرورت کیلئے زندہ تھا مَیں

ہو سکی افسوس یہ خدمت تری
مجھ سے مستغنی رہی میّت تری

اب کرے گا کون میرا انتظار خط لکھے گا کون مجھ کو بار بار
کون اب لے گا بلائیں بے شمار کون میرے دُکھ سے ہو گا بیقرار

اب حقیقی مادری شفقت کہاں
بے غرض بے مدعا الفت کہاں

قطع کرنی پڑ گئی راہِ بعید — تاکہ جنّت میں ہو تیری بازدید
اے خدائے پاک اے ربِّ مجید — "منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید

ناامیدی اُس کی دیکھا چاہیئے"
موت کو بھی اِک زمانہ چاہیئے

بھائیوں کے غم ستاتے ہیں مجھے — مرنے والے یاد آتے ہیں مجھے
لوگ کیوں نغمے سُناتے ہیں مجھے — میں نہیں روتا رُلاتے ہیں مجھے

کیا خبر اِن کو مِرا کیا حال ہے
میری ہستی کس قدر پامال ہے

غروبِ آفتابِ سخن

(یہ نظم حفیظ نے اپنے اُستاد حضرت مولانا گرامی قدس سرہٗ کی وفات پر لکھی)

صُبح کے ساحل سے جو کشتی چلی تھی نُور کی
آخرِ کار اُس نے طے کر لی مسافت دُور کی

شُکر ہے دریائے ہستی کا کنارا مل گیا
بے سہارا حسرتوں کو اِک سہارا مل گیا

اس مسافر کے لئے منزل ہے ساحل شام کا
کٹ گیا لمبا سفر وقت آگیا آرام کا

آرزو نے پاؤں پھیلائے ہیں سونے کے لئے
ولولے بیتاب ہیں آسودہ ہونے کیلئے

اب یہ محشر خواب کے طوفان میں کھو جائیگا
نیند آجائے گی چُپ ہو جائے گا سو جائیگا

شام نے کچھ اس طرح پھیلا دیا ہے دامِ خواب
موت کی تاریکیوں میں گھر گیا ہے آفتاب
اِس غمِ جانکاہ میں چشمِ شفق خونبار ہے
بادلوں کا اِک جلوسِ ماتمی تیار ہے
نُور کے شعلے کو یہ کالا کفن پہنائیں گے
پھر اُٹھا کر پردۂ ظلمات میں لے جائینگے
بزمِ ہستی کا چراغِ حُسن گل ہو جائے گا
روزِ روشن رات کی آغوش میں سو جائیگا

یاس ہی کے دل میں رہتی ہے مگر اُمّید بھی
شام ہوتی ہے ہمیشہ صبح کی تمہید بھی
لیکن اے بختِ سیہ یہ شام ہے شامِ فراق
اس کے دامن میں نظر آتے ہیں ایّامِ فراق

چھپ رہا ہے اسکے پردے میں اک ایسا آفتاب
پھر طلوعِ صبحِ محشر تک نہیں جس کا جواب

اپنے بدقسمت ستاروں کو بلا اے آسماں
سوچتا کیا ہے صفِ ماتم بچھا۔ اے آسماں
جا رہا ہے بختِ روشن پھر نہ واپس آئیگا
کون دنیا میں ترے اقبال کو چمکائے گا

بے زباں تاروں کی عشرت کیا ہے بزمِ خواب ہے
یہ چمک کچھ بھی نہیں ہے آنسوؤں کی آب ہے
آہ وہ خرمن جہاں سے جھولیاں بھرتے تھے یہ
جس شعاعِ نور سے کسبِ ضیا کرتے تھے یہ
آج وہ خورشیدِ عالمتاب خود گہنا گیا
چشمۂ آبِ بقا تاریکیوں میں آگیا

مادرِ گیتی سیہ پوشی کی تیاری کرے
میّتِ فرزند پر ماتم کرے زاری کرے

اے عروسِ زندگانی لُٹ گیا تیرا سہاگ
سرد کر ڈالی قضا نے سینۂ اُلفت کی آگ

اے دُلہن زیور بڑھا دے اوڑھ لے چادر سیاہ
ہمکنارِ مرگ ہے تیرا شہِ خاور سیاہ

پتلیوں میں آ بسی جانِ گرامی دیکھ لے
پھر نہ دیکھے گی کبھی شانِ گرامی دیکھ لے

ہے لباسِ شعر خونِ آرزو سے لالہ زار
قبر ہے رنگینیوں کی یا گرامی کا مزار

اُٹھ گیا دِن کا عمل۔ رات آگئی۔ خاموش رات
اِک بھیانک رات۔ اندھی رات۔ ماتم پوش رات

اے نگاہِ حسن جا اپنے سیہ خانے میں بیٹھ!
سرمگیں پلکیں جھکا لے بند کاشانے میں بیٹھ!

اڑ گیا اے حسن! تصویرِ وفاداری کا رنگ
عشق کے جذبات میں آیا ہوس کاری کا رنگ

ہر طرف تاریکیاں چھائیں اجالا چھپ گیا
تیری عصمت کی گواہی دینے والا چھپ گیا

اے جنونِ عشق داماں و گریباں چاک کر
اپنے ہاتھوں اپنی ہستی کو سپردِ خاک کر

اب تری تصویرِ وحشت پیکرِ بے رنگ ہے
مٹ گئی دنیائے دل میدانِ ہستی تنگ ہے

اب نمائش چاہتا ہے دیدۂ نظارہ بیں
اب کسے آئے گا تیری پاکبازی کا یقین

اے زبانِ شوق تیری شعلہ گفتاری گئی
اے متاعِ ذوق تیری گرم بازاری گئی
دن ڈھلے ہیں بلبلِ باغِ سخن کے ہمصفیر
ہو چکے ہیں اپنے اپنے آشیانوں میں اسیر
اب یہاں موجِ شمیمِ جاں فزا اٹھے تو کیوں
نالۂ جانکاہِ بلبل کی صدا اٹھے تو کیوں
اب گلستانِ سخن اجڑا ہوا ویرانہ ہے
سرد۔ بے دل۔ بے زباں آہوں کا ماتم خانہ ہے
اب صبا آتی ہے تھرّاتی ہوئی ڈرتی ہوئی
رنگ کی بے مائگی پر سسکیاں بھرتی ہوئی

اے تکلّم چپ نہ ہو اِک آخری فریاد کر
قبر کی خاموش دنیائے سخن ایجاد کر

ہو گئے خاموش ہنگامے تری آواز کے
اب نہ چھیڑے گا مغنّی تار تیرے ساز کے
سوئے میٹھی نیند شورانگیز افسانے ترے
اُٹھ گیا پیرِ مغاں خالی ہیں پیمانے ترے
اب تخیّل میں بھرے گا زندگی کے رنگ کون
شعلہ بن کر آپ ہو جائیگا زیبِ سنگ کون
بن گئی رنگینیٔ گفتار تصویرِ خموش
گوشۂ فردوس میں پنہاں ہُوا فردوسِ گوش
رہ گیا رنگِ سخن اُترے ہوئے پھولوں کی باس
کون پہنائے گا اب صورت کو معنی کا لباس

ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملّاح

(مجاہدِ ملّت مولانا محمد علی قدس سرہٗ کی وفات پر)

"شبِ تاریک وبیمِ موج وگردابے چنیں حائل"

نہنگانِ اجل کی نیّتیں بیداد پہ مائل

غضب تھا اِک شکستہ ناؤ کا منجدھار میں پھنسنا

وفا کی سسکیاں، قسمت کا رونا، موت کا ہنسنا

فقط اک "سرپھرا" ملّاح طوفانوں سے لڑتا تھا

ہوا کے آب کے جنّوں سے شیطانوں سے لڑتا تھا

اگرچہ ناؤ میں انبوہ در انبوہ انساں تھے

یہ سب ملّاح کے ہم قوم تھے یعنی مسلماں تھے

یہ سب تھے عقل و جرأت میں ارسطو اور اسکندر
مگر آرام سے لیٹے ہوئے تھے ناؤ کے اندر
چلی جاتی تھی کشتی خشمگیں موجوں سے ٹکراتی
اُبھرتی، بیٹھتی، دبتی، دباتی اور چکراتی
کہیں گرداب کے مُنہ میں کہیں پُرشور دھارے پر
کبھی اس کے اشارے پر، کبھی اُس کے اشارے پر
ہوا کے دوش پر خونخوار عفریتوں کی فوجیں تھیں
پہاڑ اُٹھ اُٹھ کے ٹکراتے تھے یا پانی کی موجیں تھیں
فلک پر بے تحاشا دوڑتے تھے ابر کے گھوڑے
کڑکتی بجلیاں برسا رہی تھیں آتشیں کوڑے
اُڑا کرتے ہیں صدموں سے جگر کے جس طرح لختے
اکھڑتے جا رہے تھے رفتہ رفتہ ناؤ کے تختے

تعجب ہے کوئی پروا نہیں تھی ناؤ والوں کو
کہ طوفاں میں نظر آتی تھی خامی "باکمالوں" کو
انہیں معلوم تھا گرداب نے کشتی کو گھیرا ہے
گھڑی بھر میں یہ بیڑا اب نہ تیرا ہے نہ میرا ہے
انہیں دعوے تھے بحرِ زندگی میں ناخدائی کے
انہیں گر یاد تھے گرداب میں مشکل کشائی کے
یہ طوفانوں پہ کر سکتے تھے لچھے دار تقریریں
دِکھا سکتے تھے تقریروں میں طوفانوں کی تصویریں
ہوا کا رُخ ذرا بدلے تو سب کچھ جان جاتے تھے
تہِ دریا نہنگوں کی نظر پہچان جاتے تھے
یہ سب جو پاؤں پھیلائے ہوئے کشتی میں لیٹے تھے
پُرانے ناخداؤں اور ملّاحوں کے بیٹے تھے

مگر وہ "سرپھرا ملّاح" تنہا تھا اکیلا تھا

ادھر موجوں کی شدّت تھی، ادھر پانی کا ریلا تھا

وہ چِلّاتا تھا۔ اُٹھو بھائیو۔ آؤ۔ اِدھر آؤ

ذرا ہمّت دکھاؤ دست و بازو کام میں لاؤ

ہوا میں اُڑ چکی ہے دھجّی دھجّی بادبانوں کی

شکستہ ہو چکی ہے ناؤ۔ مانگو خیر جانوں کی

اُکھڑ جائیں گے تختے۔ آؤ ان کو تھام لو آکر

سلامت ہیں جو کچھ "اوزار" ان سے کام لو آکر

اِدھر سیلاب پھر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے

اِدھر گرداب بل کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

نہیں ہنگام سونے کا کھڑے ہو جاؤ۔ تن جاؤ

حوادث کے مقابل آہنی دیوار بن جاؤ

مبادا ناؤ اب کے اَور بھی کمزور ہو جائے
یہ گرداب بلا شاید وہاں گور ہو جائے
وہ چلّایا وہ چیخا منّتیں کیں آہ و زاری کی
مگر بے سود تھا سب کچھ کسی نے بھی نہ یاری کی
نہ آمادہ ہُوا کوئی بھی جرأت آزمائی پر
سبھی ہنستے رہے ملّاح کی ہرزہ سرائی پر
بُلاتا تھا وہ نامِ غیرتِ اسلام لے لے کر
جھڑک دیتے تھے لیکن سب اُسے دشنام دے دیکر
مگر ملّاح اپنے فرض کا احساس رکھتا تھا
وہ اپنے ساتھیوں کی آبرو کا پاس رکھتا تھا
اسی نے جسم پر کھائے تھپیڑے تند موجوں کے
اُسی کے ساتھ ٹکرائے ہوائے تیز کے جھونکے

وہ اپنی جان پر سہتا رہا۔ سہتا رہا تنہا
اُٹھو! ہمت کرو!! کہتا رہا کہتا رہا تنہا
مگر ہنستے رہے۔ ہنستے رہے غفلت کے شیدائی
اسی کشتی کے ہمراہی اسی ملاح کے بھائی
اُدھر بڑھتی رہی۔ بڑھتی رہی دریا کی طغیانی
اِدھر گھٹتی رہی۔ گھٹتی رہی توفیق انسانی
شکستہ ناؤ کا ملاح بے دم ہو گیا آخر
بڑھا کر حوصلہ تن میں لہو کم ہو گیا آخر
گرا دریا میں چپّو۔ ہاتھ سے پتوار بھی چھوٹی
شکستہ ہو گئے بازو مگر ہمت نہیں ٹوٹی
وہ کشتی کے محافظ ڈھونڈتا تھا اب بھی یاروں میں
انہیں تاکید کرتا تھا اشاروں ہی اشاروں میں

مگر اُس کے اشاروں کو سمجھ سکتا نہ تھا کوئی
سمجھ سکتا بھی ہو۔ تو اس طرف تکتا نہ تھا کوئی

تھکن کا ہو رہا تھا اب اثر آہستہ آہستہ
لگا جھکنے وہ سر افراز سر آہستہ آہستہ

وہی سر جو ہواؤں سے نہ طوفانوں سے جھکتا تھا
نہ فرعونوں سے جھکتا تھا نہ ہامانوں سے جھکتا تھا

نہ جھکتا تھا کبھی میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہ سر۔ اک مرتبہ پھر جھک گیا اللہ کے آگے

تعجب سے ردائے ابر میں سے برق نے جھانکا
کہ یہ اک آخری سجدہ تھا اُس مردِ مسلماں کا

شکستہ ناؤ میں طوفان کی اس چیرہ دستی میں
وہ اپنا فرض پورا کر چکا تھا بحرِ ہستی میں

نہ رو - او بے حمیّت قوم! اب رونے سے کیا حاصل!!
دکھانے کے نہیں قابل یہ مُنّہ دھونے سے کیا حاصل!!

ترا رونا تری طرزِ ستم سے بھی نرالا ہے
اُسے روتی ہے جس کو تو نے خود ہی مار ڈالا ہے

درِ توبہ۔ بغیرِ توبہ ہرگز کھُل نہیں سکتا
لہو کا داغ رسمی آنسوؤں سے دُھل نہیں سکتا

ننھی اصغری

(ایک دوست کی بچّی کے مرنے پر)

دُنیا میں آگیا تھا رحمت کا اک فرشتہ
ہم خاکیوں سے آکر جوڑا تھا اُس نے رشتہ

اُلفت کا بیج بو کر فردوس کو سدھارا
اللہ کی رضا پر کیا زور ہے ہمارا

ننھی سی ایک چڑیا جنّت سے آگئی تھی
آنکھوں میں بس گئی تھی دل میں سما گئی تھی

مَن موہنی سی مَینا کچھ روز چہچہائی
لیکن ہوا یہاں کی اُس کو نہ راس آئی

آخر اُداس ہو کر چُپ چاپ اُڑ گئی وہ
جنّت سے آئی تھی وہ جنّت کو مُڑ گئی وہ

لَوٹے گی اب نہ ہرگز ہم لاکھ اُسے بُلائیں
چاہے ہزار پیٹیں رو رو کے سر کھپائیں

اب کیا بنا سکے گا رو رو کے جان کھونا
رونے سے فائدہ کیا؟ بے فائدہ ہے رونا

ہاں یاد آ رہی ہیں اُس کی وہ ساری باتیں

وہ بھولی بھولی صورت　　وہ پیاری پیاری باتیں

وہ ہم سنوں سے مل کر　　بے اختیار ہنسنا
وہ یار بار باتیں　　وہ بار بار ہنسنا

ہوتا نہ تھا کسی سے　　جھگڑا فساد اُس کو
اور "شاندار گنگا"　　ساری تھی یاد اُس کو

نظمِ حفیظ پڑھنا　　ہر ایک کو سُنانا
"میرا سلام لے جا"　　میٹھے سُروں میں گاتا

اِک پاک رُوح تھی یا　　معصوم اصغری تھی
سچ مچ وہ نیک بچّی　　جنّت کی تیتری تھی

نیند آگئی ہے اُس کو پھولوں میں سوگئی ہے
تصویر کی طرح سے خاموش ہوگئی ہے

تم چاہتے ہو اسلم رو کر اُسے جگانا
گویا سمجھ رہے ہو اس نیند کو بہانا

سونے دو سو رہی ہے اب مت اُسے جگاؤ
اس دُکھ بھرے جہاں میں واپس نہ پھر بلاؤ

دُنیا ہے سُکھ سے خالی دُکھ چار سُو بھرا ہے
غم کے سوا یہاں پہ سوچو تو کیا دھرا ہے

موت کا قافلہ

کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

آتی ہے آوازِ درا
یہ قافلہ ہے موت کا
دیکھو وہ گرد اُڑتی ہوئی   افلاک پر چڑھتی ہوئی
ہر موڑ پہ مُڑتی ہوئی   ہر سمت کو بڑھتی ہوئی
حسرت بھری خاموشیاں
ہیں ساتھ ساتھ اسکے رواں
آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں   گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
یہ قافلہ ہے موت کا
آتی ہے آوازِ درا

ہاں موت ہے یہ موت ہے!

اپنا سفر کرتی ہے طے

یعنی ہر ہستی کو پکڑتی ہے سر کرتی ہوئی

ہر اک بلند و پست کو زیر و زبر کرتی ہوئی

کہسار کیا میدان کیا

آباد کیا ویران کیا

یہ سب کو ٹھکراتی ہوئی زیرِ نگیں لاتی ہوئی

اپنا سفر کرتی ہے طے

ہاں موت ہے یہ موت ہے!

بچے درندوں کی طرح

بازو پرندوں کی طرح

ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پہ افسردگی لیٹی ہوئی

ڈائن کی صورت سر بسر   آزردگی لپٹی ہوئی

آنکھیں ہیں پتھرائی ہوئی

اور مردنی چھائی ہوئی

پچکے ہوئے سے گال ہیں   بکھرے ہوئے سے بال ہیں

بازو پرندوں کی طرح

پنجے درندوں کی طرح

اس کی خوشی ماتم میں ہے

اس کی مسرت غم میں ہے

نالے نہیں یہ درد کے   اس دیوی کا راگ ہے

جھونکے ہوائے سرد کے   اس کے نفس کی آگ ہے

جس شہر میں جلتی ہے یہ

جس راہ پر چلتی ہے یہ

یاروں سے دل برداشتہ

پیاروں سے دل برداشتہ

یہ پریم گھاتی موت کے　　موہ لوبھ تج کر آئے ہیں

سارے براتی موت کے　　پھولوں میں سج کر آئے ہیں

عاشق وفا بھولے ہوئے

معشوق ادا بھولے ہوئے

بیوی کا دل توڑے ہوئے　　بچّوں سے مُنہ موڑے ہوئے

پیاروں سے دل برداشتہ

یاروں سے دل برداشتہ

کہتی ہے آوازِ جرس

اللہ بس۔ باقی ہوس

سُنتے ہیں سب شاہ و گدا　　یہ موت کی آواز ہے

ހައި ހިތާ ހަމަ ކުރީ

ހައި ކުރި ހަމަ ހިތުގާ

ހިޔާ ހަރުދަނާ ހިތަކީ ހިތާ ހިތުން

ހިތުން ބަހާ ހިޔާ ހުސް

ހިތުން ހިތަ ހޯދާ ހިތް

ހިސާބު ހިތާ ހިތާ ހިތަ ހިތުން ހޯދާ ހިތް

ހިތުގާ ހިތަ ހޯދާ ހިތަ ހިތުން ހޯދާ ހިތް

ހައި ކުރި ހަމަ ހިތުގާ

ހައި ހިތާ ހަމަ ކުރީ

ހުރި ހިތާ ލިބި ހިތާ

ހުރި ހިތާ ލިބި ހިތާ

ހައި ހިތާ ހަމަ ކުރީ ހިތާ ހުރި ހިތާ

سب ہیں اسی کے ہم نوا　　کتنا سریلا ساز ہے
لاچار ہیں مجبور ہیں
اس سحر میں مسحور ہیں
یہ نیند کے ماتے ہیں سب　　سوتے چلے جاتے ہیں سب
کہتی ہے آوازِ جرس
اللہ بس، باقی ہوس

~~~~~~~~~~

یہ قافلہ ہے موت کا
بس یونہی چلتا جائے گا
اس قافلے کے ہم سفر　　بس یونہی بڑھتے جائینگے
سود و زیاں سے بے خبر　　زوروں پہ چڑھتے جائینگے
یہ تیز رَو آتش قدم
جائیں گے تا حدِّ عدم
~~~~~~~~~~

منزل مگر معدوم ہے   اللہ کو معلوم ہے

بس یونہی چلتا جائے گا

یہ قافلہ ہے موت کا!

عصائے پیری

گیا وہ ہنگامِ خود پرستی
اُجڑ چکی ولولوں کی بستی

خزاں کے ہاتھوں سے لُٹ چکی ہے ہوس کی شوخی ہوا کی مستی
شباب کی وادیٔ طرب سے گزر گیا کاروانِ ہستی
عدم کا پُر ہول راستہ ہے اُدھر بلندی اِدھر ہے پستی
گیا وہ ہنگامِ خود پرستی

سفر ہے اور رات کا اندھیرا نہ جانے کب آئے گا سویرا
ٹھہر کے چلنا ہے غیر ممکن کہ عمر کا لد چکا ہے ڈیرا
گرہ میں زادِ سفر نہیں ہے ہے جان کی تاک میں لٹیرا
غرض پرستوں کی ہمرہی ہے نہ کوئی تیرا نہ کوئی میرا
سفر ہے اور رات کا اندھیرا

قدم قدم پر ہزار ٹھوکر — نہ عشق ساتھی نہ عقل رہبر
سنبھل کے چلنا ہے سخت مشکل — کہ پاؤں جمتے نہیں زمیں پر
کہیں ذرا بھی جو پیر پھسلا — تو ٹکڑے ٹکڑے ہے کاسۂ سر
نزاکتِ راہ کی وہ حالت — اور اُس پہ یہ تند و تیز صرصر
قدم قدم پر ہزار ٹھوکر

ہے دامنِ ہوش پارا پارا — حواس بھی کر گئے کنارا
مگر چلے جا رہے ہیں رہرو — کہ اب نہیں کوئی اَور چارا
فضائے اُمّید کی جبیں پر — چمک رہا ہے بس ایک تارا
کہ ہے تو فرزند ساتھ میں ہے — عصائے پیری ہے یہ سہارا
چمک رہا ہے بس ایک تارا

نیندوں کی بستی

خاموش۔ خاموش

اے دوست۔ خاموش!

اے رونے والے اے فاتحہ خواں
یہ سرزمیں ہے شہرِ خموشاں
سوئے پڑے ہیں ہستی کے طوفاں
غمہائے امروز فردا کے ارماں
ناکامیِ دوش
خاموش خاموش

خاموش۔ خاموش

اے دوست۔ خاموش!

بیٹھے ہیں مل کر — سانجھ اور سویرا
دھندلی ضیا ہے — اُجلا اندھیرا
اس وقت کوئی — تیرا نہ میرا
اُترا ہُوا ہے — رُوحوں کا ڈیرا

آنکھوں سے رُوپوش

خاموش۔ خاموش

خاموش۔ خاموش

اے دوست۔ خاموش!

اے جنبشِ لب — ہاں ہاں خبردار!
باطل نہ ہو جائے — یہ سحر زنہار

ہیں آج یک جا عجز اور پندار
پہلو بہ پہلو مجبور و مختار
ہشیار و مدہوش
خاموش خاموش!

خاموش۔ خاموش!
اے دوست۔ خاموش!
خاموشیوں میں گُم ہیں صدائیں
بے کار ہیں سب یہ التجائیں
کس کو پکاریں کس کو بُلائیں
یہ بیوی بچّے یہ باپ مائیں
ہیں پنبہ در گوش۔
خاموش۔ خاموش!

ایک لڑکی شاداں

یہ نظم میری عزیز بیٹی ارشاد بتول کی یادگار ہے

میں نے ایک مدت تک بچوں کے لئے نظمیں لکھی ہیں ان نظموں کو میری سب سے بڑی بیٹی ارشاد بتول جسے میں پیار سے "شاداں" کہا کرتا تھا بڑے شوق سے پڑھتی تھی۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں جب میں نے پھول کی سالگرہ نمبر کیلئے متعدد نظمیں لکھیں تو ان میں سے ایک نظم یہ بھی تھی میں اس وقت سفر میں تھا۔ میرے بال بچے جالندھر میں جہاں "شاداں" مدرسہ بنات میں قرآن مجید پڑھ رہی تھی۔ اس نظم سے مقصود محض شاداں کو دق کرنا تھا میں نے لکھا کہ وہ پڑھتی پڑھاتی کچھ نہیں سارا دن کھیل کود میں ضائع کر دیتی ہے خیال یہ تھا کہ اول تو وہ اس نظم کو اپنے نام پر دیکھکر خوش ہوگی جب اسے پڑھے گی تو پڑھ کر بگڑیگی اور اس طرح خوب ہنسی مذاق رہیگا۔ ان پرلطف خیالات کو لئے جس روز میں گھر پہنچا اسی دن شام کو یہ بچی جو میری آنکھوں کا نور تھی اچانک کنوئیں میں گر کر جاں بحق تسلیم ہوگئی پھول کا سالگرہ نمبر اسوقت ملا جب میں اپنے لختِ جگر کو سپرد خاک کر چکا تھا۔ حفیظ

اک لڑکی تھی چھوٹی سی
دُبلی سی اور موٹی سی
ننھی سی اور مُنّی سی
بالکل ٹھُن مٹھنّی سی
اُس کے بال تھے کالے سے
سیدھے گھنگریالے سے
مُنہ پر اُس کے لالی سی
چِٹّی سی مٹیالی سی
اُس کی ناک پکوڑی سی
نوکیلی سی چوڑی سی

آنکھیں کالی نیلی سی — سُرخ سفید اور پیلی سی
کپڑے اُس کے تھیلے سے — اُجلے سے اور میلے سے
یہ لڑکی تھی بھولی سی — بی بی سی اور گولی سی
ہر دم کھیل تھا کام اُس کا — شاداں بی بی نام اُس کا
ہنستی تھی اور روتی تھی — جاگتی تھی اور سوتی تھی
ہر دم اُس کی امّاں جان — کھینچا کریں اُس کے کان
کہتی تھیں مکتب کو جا — کھیلوں میں مت وقت گنوا
امّی سب کچھ کہتی تھی — شاداں کھیلتی رہتی تھی

اِک دن شاداں کھیل میں تھی — آئے اُس کے ابّا جی
وہ لاہور سے آئے تھے — چیزیں ویزیں لائے تھے
بکس میں تھیں یہ چیزیں سب — خیر تماشا دیکھو اب
ابّا نے آتے ہی کہا — شاداں آ کچھ پڑھ کے سُنا
گُم تھی اِک مدّت سے کتاب — کیا دیتی اُس وقت جواب
دو بہنیں تھیں شاداں کی — چھوٹی ننھی منّی سی

نام تھا منجھلی کا سیماں   گڑیا سی ننھی ناداں
وہ بولی اے ابا جی   اب تو پڑھتی ہوں میں بھی
بلی ہے سی اے ٹی کیٹ   چوہا ہے آر اے ٹی ریٹ
منہ ماؤتھ ہے۔ ناک ہے نوز   اور گلاب کا پھول ہے روز
میں نے اباجی دیکھا   خوب سبق ہے یاد کیا
شاداں نے اس وقت کہا   "میں نے ہی تو سکھایا تھا"
لیکن ابا نے چپ چاپ   کھولا بکس کو اٹھ کر آپ
اس میں جو چیزیں نکلیں   ساری سیماں کو دیدیں
اِک چینی کی گڑیا تھی   اِک جادو کی چڑیا تھی
اِک ننھی سی تھی موٹر   آپ ہی چلتی تھی فرفر
گیندوں کا اک جوڑا تھا   اِک لکڑی کا گھوڑا تھا
اِک سیٹی تھی اِک باجا   ایک تھا مٹی کا راجا
شاداں کو کچھ بھی نہ ملا   یعنی کھیل کی پائی سزا

اب وہ غور سے پڑھتی ہے
پورے طور سے پڑھتی ہے

ارشاد کی یاد میں

اک بار پھر وطن میں گیا جا کے آگیا
لختِ جگر کو خاک میں دفنا کے آگیا

ہر ہم سفر پہ خضر کا دھوکا ہُوا مجھے
آبِ بقا کی راہ سے کترا کے آگیا

حورِ لحد نے چھین لیا تجھ کو اور میں
اپنا سا مُنہ لیے ہوئے شرما کے آگیا

دل لے گیا مجھے تری تربت پہ بار بار
آواز دے کے دیکھ لیا اُکتا کے آگیا

رویا کہ تھا جہیز ترا واجب الادا
مینہ موتیوں کا قبر پہ برسا کے آگیا

میری بساط کیا تھی حضورِ رضائے دوست
تنکا سا ایک سامنے دریا کے آگیا

اب کے بھی راس آئی نہ حُبِّ وطن حفیظ
اب کے بھی ایک تیرِ قضا کھا کے آگیا

ارشاد بتول ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو اچانک کنوئیں میں گر گئی اور جاں بحق ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر کا دسواں سال تھا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

عیدِ نظّارہ

کوثر چکد از لبم بہ ایں تشنہ لبی
خاور دمد از شبم بایں تیرہ شبی
اے دوست ادب در حریمِ دلِ ماست
شاہنشہِ انبیاء رسولِ عربیؐ

عیدِ میلادُ النّبی

زندگی مُردہ تھی رُوحِ زندگی افسُردہ تھی
خامیٔ تخلیق اپنے آپ سے آزردہ تھی

جلوے افسردہ تھے اپنی خامیٔ تکمیل سے
عشق تھا روپوش اب تک حسن کی قندیل سے

سازِ فطرت تھا ابھی مضراب سے ناآشنا
نغمہ تھا اِک لذّتِ بیتاب سے ناآشنا

سو رہی تھی زندگانی خواب کے آغوش میں
آرزوئیں دم بخود تھیں حسرتِ خاموش میں

باغ سے موجِ شمیمِ جانفزا اُٹھتی نہ تھی
نالۂ جانکاہِ بلبُل کی صدا اُٹھتی نہ تھی
آنکھ تھی لیکن ابھی تک اشک سے محروم تھی
کامیابی کی تمنّا رشک سے محروم تھی
رُوح نے اب تک دعاؤں کے مزے پائے نہ تھے
خامشی نے التجاؤں کے مزے پائے نہ تھے
عالمِ ایجاد تھا کچھ اس طرح۔ یعنی نہ تھا
آفرینش لفظ تھا۔ شرمندۂ معنی نہ تھا
یک بیک اُمّید کے گھر میں خوشی پیدا ہوئی
زندگی کے واسطے اک زندگی پیدا ہوئی
سینۂ ہستی میں کروٹ لی دلِ بیتاب نے
پڑھ لیا یعنی حرارت کا سبق سیماب نے

رُوئے فطرت پر محبت کی ضیا پیدا ہوئی
حُسن کی آنکھیں جھکیں۔ اُن میں حیا پیدا ہوئی
ناگہاں ساکن ہواؤں میں روانی آگئی
اور چمن کے پتّے پتّے پر جوانی آگئی
سینۂ غنچہ میں اک میٹھی کسک پیدا ہوئی
گل میں خوشبو اور شاخوں میں لچک پیدا ہوئی
سبزۂ خوابیدہ جاگا لہلہانے کے لئے
ہوگئیں بے تاب کلیاں مسکرانے کے لئے
آج زانوئے ازل پر صبح نے انگڑائی لی
مسکرا کر اک کرن نے ہاتھ میں شہنائی لی
غُل ہُوا دُنیا میں ختم المرسلینؐ پیدا ہُوا
مخزنِ اسرارِ قدرت کا امیں پیدا ہُوا

کشتیِ ارض و سما کا ناخدا پیدا ہُوا
ابتدا و انتہا کا پیشوا پیدا ہُوا

عرش پر سے شادیانوں کی صدا آنے لگی
سازِ الفت سے ترانوں کی صدا آنے لگی

فرش پر روح الامیںؑ آنے لگے جانے لگے
طائرانِ قُدس نغمے نعت کے گانے لگے

دھیمے دھیمے رس بھرے نغمے ہوائیں بس گئے
میٹھے میٹھے گیت حوروں کے فضائیں بس گئے

بس گیا آکر فضا میں لشکرِ نورانیاں
اور پیشِ نورِ مطلق جُھک گئیں پیشانیاں

پَرِ فرشتوں کے کُھلے انوار لہرانے لگے
نُور کے بادل زمیں پر پھُول برسانے لگے

کعبۂ توحید پر رکھ کر جبیں سات آسماں
جُھک گئے تعظیم کو پیشِ زمیں سات آسماں
تھی یہ صبحِ زندگی تمہیدِ میلادُ النّبیؐ
آپ خالق نے منائی عیدِ میلادُ النّبیؐ

ہلالِ عید

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

رنگ بھرے سحاب میں — ڈوب گیا ہے آفتاب
چھپ نہ سکا نقاب میں — خندۂ حسنِ بے حجاب

منظرِ باغِ پُر بہار
ور فرازِ کوہسار
چادرِ آبِ جوئبار
ہو گئے سب طلانگار

نورِ شفق نے بھر دئے — رنگ سے کوہ وسقف وبام
حسنِ نظر نے کر دئے — دیدہ ورُوح شادکام

کر دیا شام نے تمام
دامنِ غرب لالہ فام

ہوگئی نرم رَد ہَوا
محوِ سکوت ہے فضا

دن کے تھکے ہوئے کسان اپنے گھروں میں آگئے
دشت نوردِ ساربان چشمۂ آب پا گئے

خوش ہیں تمام روزہ دار
خوش ہوا اُن سے کردگار

بند ہیں سارے کاروبار
آنکھ ہے وقفِ انتظار

منتظرِ نوید ہے صبر و سکوں امید کا
ضبطِ دروں شہید ہے تیغِ ہلالِ عید کا

ہوگئی نرم رَد ہَوا
محوِ سکوت ہے فضا

آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر

طفل ربا امنگ سے   شاہ و گدا نہال ہے
جوشِ طرب کے رنگ سے   چہرۂ شوق لال ہے

حُسن بھری بلندیاں
دیکھ رہی ہیں آسماں
چشمِ فلک سے بھی نہاں
محوِ نظر ہیں بیبیاں

سُرخ شفق کی ڈھال ہیں   گڑ گئے بے شمار تیر
جستجوئے ہلال میں   گم ہیں کئی مہِ منیر

آج ہیں سب جوان و پیر
ایک لکیر کے فقیر

جوشِ خوشی سے یک بیک
بس گیا گنبدِ فلک

مسلمِ روزہ دار نے ختم کیا مہِ صیام
سازِ طرب کے تار نے توڑ دیا سکوتِ شام

دیکھ رہا ہے آسماں
آج زمین کا سماں
دشت و جبل میں ناگہاں
گونج اُٹھیں سلامیاں

سُن کے ترانۂ دُعا وَجد میں آ گئے مَلک
چھا گیا ایک نُور سا فرشِ زمیں سے عرش تک

جوشِ خوشی سے یک بیک
بَس گیا گنبدِ فلک

مِل گئی عید کی نوید
دیکھ لیا ہلالِ عید
ارض وسما میں دفعتاً بانگِ اذاں ہوئی بلند
ایک صدا میں دفعتاً ہوگئی ہر زبان بند
ایک جہانِ پاکباز
کرکے وضو پئے نماز
دل کو کئے ہوئے گداز
جُھک گیا پیشِ بے نیاز
بندہ اِدھر اُدھر خُدا لطف اُدھر۔ اِدھر اُمید
عجز اِدھر۔ اُدھر عطا گفت اِدھر۔ اُدھر شنید
مِل گئی عید کی نوید
دیکھ لیا ہلالِ عید

شہیدوں کی عید

فرض پورا کر چکے فرصت ملی ہر کام سے
مقبروں میں سو رہے ہیں آج کس آرام سے
صبح کی صورت اُٹھے تھے رات کے آغوش سے
ہو گیا زندہ عمل کا جوش ان کے جوش سے
ان کا اُٹھنا تھا کہ تقدیرِ اُخوت جاگ اُٹھی
خوابِ غفلت میں پڑی تھی آدمیت جاگ اُٹھی
اِن سروں پر سایہ افگن تھا علم اسلام کا
ان لبوں پر وِرد تھا اللہ کے پیغام کا

آیۂ رحمت تھے یہ سارے زمانے کے لئے
آئے تھے اُجڑی ہوئی دنیا بسانے کے لئے
ہوگئیں آباد ان کے نام سے آبادیاں
رشکِ جنّت بن گئیں انکے لہو سے وادیاں
بام و در، کہسار و میداں، خشک و تر پست و بلند
ہو گئے اللہ والوں کی صدا سے بہرہ مند
زندگی میں بس گئے آباد کاروں کی طرح
زیست کی مدّت گزاری روزہ داروں کی طرح
پیکرِ ہستی میں جب روحِ محبت بھر چکے
آئے تھے جس کام کو وہ کام پورا کر چکے
آخر ان کی عمر کا دن ڈھل گیا شام آگئی
یعنی صبحِ عید کا شب لے کے پیغام آگئی

آخری روزہ کیا افطار حق کے نام پر

بہرِ اظہارِ اطاعت جُھک گئے سجدوں میں سر

قبلہ رُو ہو کر مصلّوں پر نمازی سو گئے

فتح کر کے جنگ کو مردانِ غازی سو گئے

رات ان کی ہے کہ روزِ عیش کی تمہید ہے

اِن شہیدوں کے لئے صبحِ قیامت عید ہے

یہ عید

ہماری عید نہیں

یہ عید ہے روزہ داروں کی
محبوبِ خدا کے پیاروں کی
جن کی طاعت مشکور ہوئی
پروان چڑھی منظور ہوئی
سجدوں نے جبینیں چمکائیں
منّت کی مرادیں بر آئیں
محنت کا شجر پھل لایا ہے
دن فضلِ خدا کا آیا ہے
یہ بخشش کی امید کا دن
یاروں کے لئے ہے عید کا دن

رحمت کی گھٹائیں چھائی ہیں — قبلے کی طرف سے آئی ہیں
وا ہیں توحید کے میخانے — اور گردش میں ہیں پیمانے
ساقیٔ ازل کی چوکھٹ ہے — مستانِ الست کا جمگھٹ ہے
یہ سب اللہ کے دیوانے — شمعِ وحدت کے پروانے

توحید کے نغمے گاتے ہیں
مل مل کر عید مناتے ہیں

ہم بد قسمت ہم بیچارے — آزارِ فرقت کے مارے
عید آئی ہے کیسے مانیں — ہم عید کی خوشیاں کیا جانیں
یثرب سے نہیں پیغام آیا — غربت میں ماہِ صیام آیا
محبوب کے در سے دور رہے — لاچار ہوئے مجبور رہے

جب نورِ خدا کی دید نہیں
یہ عید ہماری عید نہیں

میرا سلام لے جا

(مدینے کو جانے والے ایک دوست سے)

قسمت کے آسماں پر　　سیمائے کہکشاں پر
چمکا ترا ستارا
اُس در پہ حاضری کا　　تجھ کو ہُوا اشارا
اے بخت یار بندے
اے کامگار بندے
تیری مراد مندی　　تقدیر کی بلندی
تجھ کو پُکارتی ہے
آ باریاب ہو جا!
اے ذرّۂ محبّت!　　جا آفتاب ہو جا!

دربار میں چلا ہے
سرکار میں چلا ہے
رختِ سفر اُٹھا لے اللہ کے حوالے
یثرب کے جانے والے بس اک پیام لے جا
میرا سلام لے جا
میری یہ سرد آہیں یہ منتظر نگاہیں
ان کا خیال کرنا
لیکن نہیں مناسب کچھ عرضِ حال کرنا
وہ جانتے ہیں سب کچھ
پہچانتے ہیں سب کچھ
ناشاد آرزوئیں برباد آرزوئیں
بے تاب ہو رہی ہیں
تاہم خوش رہنا

آنکھوں سے دیکھتا جا منہ سے مگر نہ کہنا
یہ صبح و شام میرے
سب سامنے ہیں تیرے
ان سے کوئی بھلائی دیتی نہیں دکھائی
لے جا سکے تو بھائی! یہ صبح و شام لے جا
میرا سلام لے جا
ہر چیز کھو چکا ہوں برباد ہو چکا ہوں
یہ زندگی ہے میری
اس وقت پاس میرے شرمندگی ہے میری
کچھ ارمغاں نہیں ہے
جز این و آں نہیں ہے
مفلس ہوں بینوا ہوں کچھ بھی نہیں میں کیا ہوں

تحفے نہ مانگ مجھ سے

نادم نہ کر خدارا

دل تیرے پاس ہو تو دیدے مجھے اُدھارا

میرا کلام کیا ہے؟

یہ جنسِ خام کیا ہے؟

یہ ارمغاں خوشی سے چاہے تو ہاں خوشی سے

اے مہرباں خوشی سے یہ جنسِ خام لے جا

میرا سلام لے جا

فریاد و ہاؤ ہُو میں صہبائے آرزو میں

وہ جوش ہی نہیں ہے

ٹوٹا ہُوا بھی ہے دل خاموش ہی نہیں ہے

سرشار کرنے والی

شے ہو چکی ہے خالی

میخانۂ یقیں سے اُس کیفِ بہتریں سے
ایمانِ آتشیں سے
پھر اس کو بھر کے لانا
پینے چلا ہے تو بھی اور مجھکو بھی پلانا
ٹُوٹا ہُوا ہے بے شک
پھُوٹا ہُوا ہے بے شک
ہے عرض دست بستہ گو دُور کا ہے رستہ
اور جام بھی شکستہ لیکن یہ جام لے جا
میرا اسلام لے جا
یہ اشک ریز آنکھیں طوفان خیز آنکھیں
اب خُشک ہو چکی ہیں
دریا کہاں سے لائیں قطرے کو رو چکی ہیں

ورنہ یہ آرزو تھی

مدّت سے جستجو تھی

کشتی بنا کے دِل کو اور پھر سجا کے دل کو

یثرب کے جانے والے

اس میں تجھے بٹھاؤں

دُنیائے سرمدی کے ساحل پہ لے کے جاؤں

خیر اے دلیر اچھا

ہوتی ہے دیر اچھّا

جا ہر طرح سلامت لے جا مری محبّت

لے جا مری عقیدت میرا سلام لے جا

میرا سلام لے جا

گلشنِ جنت

وہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا
مجموعہ ریگستانوں کا اور ناہموار چٹانوں کا
اک صحرا جس کے سینے پر آتش کے شرارے پھرتے ہیں
اِک ویرانہ جس میں سنّاٹے مارے مارے پھرتے ہیں
اک رقص کدہ خاموشی کا اک عِشرت گاہ بگولوں کی
سنسان بیاباں جس میں فوجیں آسودہ ہیں غولوں کی
وہ دشت جہاں پُر شور ہوائیں گرد و غبار اُڑاتی ہیں
مٹّی کی چھاؤنی چھاتی ہیں مٹّی کا فلک بن جاتی ہیں
طوفانی ریگِ رواں جس میں زہریلے طوفاں اٹھتے ہیں
غصّے میں بھر کر کالے، نیلے، پیلے طوفاں اُٹھتے ہیں

وہ مٹّی کے تودے جن پر کرنوں کی بارش ہوتی ہے
وہ ریت جو رات کی چادر میں تاروں کے نیچے سوتی ہے
وہ وسعت ذرّے ذرّے کو جو دشت بنائے بیٹھی ہے
گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے
ہاں ہاں وہ عرب جو گہوارہ ہے ظلمت سوز تمازت کا
رکھا ہے اسی پردے میں چھپا کر حق نے گلشن جنّت کا
یہ جنّت جس کی راہِ طلب میں ذرّہ ذرّہ سینا ہے
یہ شہر ہے کملی والے کا۔ اور اس کا نام مدینہ ہے

تین نغمے

حفیظ۔ ٹیگور۔ اقبال

تین نغمے

ہم نوا کوئی نہ پایا جب زمیں کے فرش پر
میرا نغمہ لے چلا مجھ کو اڑا کر عرش پر

ظلمتِ ابلیس کی راہوں سے کتراتا ہوا
بندگی کے گیت اپنے رنگ میں گاتا ہوا

جادۂ پامالِ مہر و ماہ طے کرتا ہوا
مہ بہ مہ انجم بہ انجم راہ طے کرتا ہوا

کہکشاں تا کہکشاں بڑھتا گیا بڑھتا گیا
آسماں تا آسماں چڑھتا گیا چڑھتا گیا

یہ عبودیّت کا نغمہ جانے کیا اعجاز تھا
جو ستارا میں نے دیکھا گوش بر آواز تھا

زہرۂ افلاک میری نے اُڑا کر لے گئی
نقش سوز و ساز کے دل میں بٹھا کر لے گئی

کارپردازانِ قدرت ہم سفر بنتے گئے
اپنی اپنی منزلوں تک راہبر بنتے گئے

مرحبا کہتے ہوئے ننھی سی مشتِ خاک پر
ہو گئے رخصت ستارے بامِ ہفت افلاک پر

دو فرشتے ساتھ چلتے چلتے آخر رہ گئے
اے بشر! اب تیری جرأت ہے! یہ فقرہ کہہ گئے

مَیں کہ تھا مستِ صہبائے ازل چلتا گیا
پاؤں تھک کر رہ گئے تو سر کے بل چلتا گیا

چلتے چلتے ایک ندّی راہ میں حائل ہوئی
میرے ارمانوں کی منزل گاہ میں حائل ہوئی

ہلکی ہلکی پُرسکوں لہروں میں لہراتی ہوئی
میٹھے میٹھے گیت ٹھنڈی پریت کے گاتی ہوئی

لہریا آبی دوپٹّا تا کمر لپٹا ہُوا
دامنوں سے دامنِ شام و سحر لپٹا ہُوا

عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اسکے ساتھ ساتھ
تھی ہوا اس کے لئے ہمراز مشّاطہ کا ہاتھ

جھاڑیاں تھیں یا کہ سکھیاں تھیں قطار اندر قطار
نذر لائی تھیں پھلوں کی ڈالیاں پھولوں کے ہار

نازنیں شاخیں لچکتیں سرسراتیں جھومتیں
اپنے اپنے عکس کا منہ آئنے میں چومتیں

قمریاں تھیں بلبلیں تھیں سرو تھے شمشاد تھے
شاد تھے دونوں کنارے شاد تھے آباد تھے

پھول سے کانٹا حسیں معلوم ہوتا تھا یہاں
سبزہ بیگانہ نہیں معلوم ہوتا تھا یہاں
میرے جی میں بس گئی اس کی سکوت افزا بہار
مَیں یہ سمجھا ہو گیا میرا مقدّر سازگار
پاؤں پھیلا کر خنک ندّی میں سر دُھننے لگا
آبجُو کا نغمۂ جادو اثر سُننے لگا
اب ہوا محسوس یہ سارا سماں نغمے کا ہے
یہ زمیں نغمے کی ہے یہ آسماں نغمے کا ہے
یہ عجب نغمہ تھا اطمینان بخش و بے خروش
یہ عجب نشّہ تھا جس میں کوئی بیتابی نہ جوش
محوِ گلگشتِ چمن پہنے ہوئے کلیوں کے ہار
نغمہ تھا۔ یا شام کی ٹھنڈی نسیمِ خوشگوار

نغمہ تھا یا حدّتِ خوں کے لئے برف آب تھا
یا تھکے ماندوں کی بستی میں نفیرِ خواب تھا
ہاں یہ نغمہ تھا لگی دل کی بجھانے کے لئے
برف بن بن کر رگوں میں بیٹھ جانے کے لئے
نغمہ خواب آور تھا نیند آنے لگی میں سو گیا
اپنی منزل بھول کر اس رنگ و بو میں کھو گیا
آہ ندی تھی نہ میدانِ گل و لالہ تھا یہ
نغمۂ ٹیگور تھا یہ سحرِ بنگالہ تھا یہ
دیکھ کر نغمے کا یہ افسوں میں حیران ہو گیا
میری جمعیّت کا شیرازہ پریشاں ہو گیا
پھول تھے۔ خوشبو تھی۔ نشّہ تھا فضا تھی میں نہ تھا
ساز کی دھڑکن تھی۔ نغمے کی صدا تھی میں نہ تھا

میری اپنی رُوح کے نغمے کی لَے گُم ہو گئی
قلب کو گرمانے والی کوئی شے گُم ہو گئی
ہو گیا یخ بستہ مَیں بھی اور میرا ساز بھی
بیٹھ جائے دل تو اُٹھ سکتی نہیں آواز بھی
یاد مجھ کو اب وہ پہلی زندگی آنے لگی
یعنی اس اُفتاد سے شرمندگی آنے لگی
تازیانہ بن گیا بہرِ عمل یہ انفعال
دفعتاً پیدا ہُوا خود اعتمادی کا خیال
جاگ اُٹھا مَیں اور کنارے ہی کنارے چل پڑا
سرنگوں ہارے ہوئے دل کے سہارے چل پڑا
چل رہے تھے پاؤں اپنے حال سے بے حال سے
خود بخود تھک جانے والی ڈگمگاتی چال سے

اس طرح طے کر گیا میں سرحدِ ادراک بھی
میرا سینہ تکنے لگی اب جرأتِ بیباک بھی

سامنے دیکھا تو اک دریا نظر آیا مجھے
میری منزل آ گئی ایسا نظر آیا مجھے

مل گئی تھی جا کے دریا سے یہ پیاری جوئے آب
یعنی اپنے مدعا میں ہو گئی تھی کامیاب

یہ عروسِ فکرِ رنگیں بن سنور کر آئی تھی
دامنِ آبِ رواں میں پھول بھر کر لائی تھی

اک محبت اک مسرت کے ترانے جوش میں
لے لیا تھا بڑھ کے دریا نے اسے آغوش میں

پھر مرے ذوقِ عمل کو اک سہارا مل گیا
وہ کنارا مجھ سے چھوٹا یہ کنارا مل گیا

ہاں یہ دریا تھا مگر دریائے ناپیدا کنار

خوشنما۔ پُرہول نغمہ آفریں اور پُروقار

سیل در آغوشِ سیل اور موج در آغوشِ موج

ہر طرف پُرجوش لشکر ہر طرف پُرجوش فوج

اندرونِ تہ سے لہر اُٹھتی ہُوئی چڑھتی ہُوئی

ولولوں کی طرح ہر سو پھیلتی بڑھتی ہوئی

تھے سکون ناآشنا۔ لہریں بھی اور گرداب بھی

اپنی اپنی رو میں تھے طوفان بھی سیلاب بھی

ایک طوفانِ تلاطم ایک سیلابِ رواں

ظاہرا آبِ رواں باطن میں سیمابِ رواں

سازِ قدرت واصلِ مضراب تھا دریا نہ تھا

اِک مسلسل نغمۂ بیتاب تھا دریا نہ تھا

ہوگئی بیدار میرے نغمۂ ہستی کی گونج
قلب سے اُٹھی پرانے جوش و سرمستی کی گونج

جس طرح آجائے پیاسا ساحلِ مطلوب پر
یا اچانک کوئی جا پہنچے درِ محبوب پر

اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے

درد کی چیخیں اُٹھیں میرے شکستہ ساز سے
آبدیدہ ہوگیا دریا میری آواز سے

میرا نغمہ۔ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا

ہوش نے چاہا کہ فکرِ خود فراموشی کروں
قطرہ ہوں دریا سے مل جاؤں ہم آغوشی کروں

اپنی ہستی کا ابھی تک تھا مگر دھوکا مجھے
شوق نے آگے بڑھایا ضبط نے روکا مجھے
لڑکھڑائے پائے ہمّت عشق کے آداب میں
ایک لرزش سی ہوئی پیدا مرے اعصاب میں
کھینچنے کو دوڑ کر موجوں کی زنجیریں بڑھیں
روکنے کو حفظِ خودداری کی تدبیریں بڑھیں
یہ خودی یہ بے خودی یہ ضبط اور یہ اشتیاق
اس طرح اُلجھے کہ آخر بن گئے دامِ فراق
مدّعائے زیست حاصل ہوتے ہوتے رہ گیا
جُزو اپنے کُل سے واصل ہوتے ہوتے رہ گیا

جوہرِ ذاتی

مدتوں سے اشک کے سیلاب میں بہتا ہے دل
سختیاں ہر موج طوفاں خیز کی سہتا ہے دل
دل میں سب کچھ ہے مگر مُنہ سے نہیں کہتا ہے دل
التجا کیسی دُعا سے محترز رہتا ہے دل
حاجتیں لاکھوں ہیں لیکن مانگنے سے عار ہے
شُکر کرتا ہوں کہ دل میرا بہت خود دار ہے

اپنے دامن میں لیا ہے بارگاہوں نے مجھے
اپنے پہلو میں بٹھایا بادشاہوں نے مجھے
بارہا تاکا ہے بخشش کی نگاہوں نے مجھے
اور پناہیں پیش کیں عالم پناہوں نے مجھے

رعب دولت کا مگر دل پر مرے چھایا نہیں
کچھ طلب کرنے کو میں نے ہاتھ پھیلایا نہیں
عرش کی رفعت لئے بیٹھا ہوں فرشِ خاک پر
سر مرا آسودہ ہے پائے رسولِ پاک پر
اہلِ زر ہنستے ہیں میرے دامنِ صد چاک پر
اور میں نازاں ہوں اپنی فطرتِ بیباک پر
میری فطرت نے دیا ہے جوہرِ ذاتی مجھے
دُنیوی شاہوں کی مدّاحی نہیں آتی مجھے

پروانہ پروانوں کا

جب سے دیکھا ہے جل مرنا ننھی ننھی جانوں کا
شمع کا پروانہ نہ سہی پروانہ ہوں پروانوں کا

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں آؤ کوئی کام کریں
موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا

ہر کو سرافرازی دے کر سجدوں پر مامور کیا
سر دے کر بھی ہو نہ سکے گا بدلہ ان احسانوں کا

محشر والوں نے بھی مجھ کو شاعر کہہ کر چھوڑ دیا
میری فردِ عمل کو سمجھے مجموعہ افسانوں کا

ایسی جنسِ فراہم کر لی جس کا گاہک کوئی نہیں
لادے لادے پھرتا ہوں اب پشتارا ارمانوں کا

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل کیا چلنا
میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

بیڑا پار لگانے والے میرا منہ کیا تکتا ہے
میں تو ساحل پر رہ کر بھی خوگر تھا طوفانوں کا

صدا الصحرا

درۂ خیبر

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے۔ نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے۔ ہوا کترا کے چلتی ہے

یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے

یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونی لکیریں ہیں

یہ ذرّے رہرووں کی ہمّتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں
لئے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دُنیا بھر کے ہنگامے
یہ بے آباد۔ وہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ
انہی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گذرا
زمینِ ہند پر جاتا ہُوا اک آسماں گذرا
اسی رستے سے ہو کر ہنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے۔ کئی آباد کار آئے
یہ مٹّی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اُسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک
اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

فلک نے اِس زمیں پر بارہا محمُود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا
اُڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دُھواں ہو کر
اسے تیمور نے روندا۔ اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا
یہاں سے بارہا گزرے اٹالے بارگاہوں کے
قدم چُومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے
کہاں اب وہ شکوہِ نادری اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی
یہ ہے وہ خارزار۔ اس میں ہزاروں آبلے پھُوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے
ہوائے ذرّۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

شہر پومپی آئی کی آخری رات

سیاہی بن کے چھایا شہر پر شیطان کا فتنہ
گناہوں سے لپٹ کر سو گیا انسان کا فتنہ

پناہیں حُسن نے پائیں سیہ کاری کے دامن میں
وفاداری ہوئی روپوش ناداری کے دامن میں

میسّر ہیں زری کے شامیانے خوش نصیبی کو
اُڑھا دی سایۂ دیوار نے چادر غریبی کو

مُشقّت کو سکھا کر خوبیاں خِدمت گذاری کی
ہوئیں بے خوف بے ایمانیاں سرمایہ داری کی

لیا آغوش میں پھولوں کی سیجوں نے امیری کو
مہیّا خاک ہی نے کر دیئے آسن فقیری کو

تڑپنا چھوڑ کر چپ ہو گئے جی ہارنے والے
مزے کی نیند سوئے تازیانے مارنے والے
وہ روحانی وہ جسمانی عقوبت کم ہوئی آخر
غلامی بیڑیوں کے بوجھ سے بے دم ہوئی آخر
ہوئے فریادیوں پر بند ایوانوں کے دروازے
کہ خود محتاجِ درباں ہیں جہانبانوں کے دروازے
اُسی انداز سے جاسوئی غفلت بادشاہوں کی
سرور و کیف بن کر چھا گئیں نیندیں گناہوں کی
شرابیں ختم کر کے ہو گئے خاموش ہنگامے
بالآخر نیند آئی سو گئے پرجوش ہنگامے
تھا جب زندگی کا جوش پر خاشِ اجل جاگی
عمل کو دیکھ کر مدہوش پاداشِ عمل جاگی

اُٹھایا موت نے پتھر جہنّم کے وہانے سے
جہاں آتش کا دریا کھولتا تھا اِک زمانے سے
بلندی سے تباہی کے سمندر نے کیا دھاوا
چٹانوں کے جگر سے پھوٹ نکلا آتشیں لاوا
دکھادی آگ ایوانوں کو مظلومی کی آہوں نے
اُٹھائے شعلہ ہائے آتشیں بیکس نگاہوں نے
اُٹھیں مختار بن کر بے کسی کے خون کی موجیں
حصارِ مرگ نے محصور کرلیں جنگ جو فوجیں
نہ حسن و عشق نے پائی اماں قہرِ الٰہی سے
دبی یاداش امیری سے فقیری سے نہ شاہی سے
ستاروں کی نگاہوں نے دھواں اُٹھتا ہُوا دیکھا
مگر خورشید نے کچھ بھی نہ مٹی کے سوا دیکھا

رقّاصہ

ضرورت نہیں کہ نظم کی شانِ نزول بیان کی جائے حساس دل اس تلخ ساعت کا خود بخود اندازہ کرلے گا۔

اُٹھی ہے مغرب سے گھٹا پینے کا موسم آگیا
ہے رقص میں اک مہ لقا
نازک ادا ناز آفریں

ہاں ناچتی جا گائے جا نظروں سے دل برمائے جا
تڑپائے جا تڑپائے جا
او دشمنِ دُنیا و دیں!

تیرا تھرکنا خوب ہے تیری ادا ہیں دل نشیں
لیکن ٹھیر تو کون ہے او نیم عریاں نازنیں
کیا مشرقی عورت ہے تُو ہر گز نہیں ہر گز نہیں
تیری ہنسی بے باک ہے
تیری نگہ چالاک ہے

اُف کِس قدر دِل سوز ہے — تقریر بازاری تری
کتنی ہوس آموز ہے — یہ سادہ پُرکاری تری

شرم اور عزّت والیاں
ہوتی ہیں عفّت والیاں

وہ حُسن کی شہزادیاں — پردے کی ہیں آبادیاں
چشمِ فلک نے آج تک — دیکھی نہیں اُن کی جھلک
سرمایۂ شرم و حیا — زیور ہے اُن کے حُسن کا
شوہر کے دُکھ سہتی ہیں وہ — مُنہ سے نہیں کہتی ہیں وہ
کب سامنے آتی ہیں وُہ — غیرت سے کٹ جاتی ہیں وہ
اعزازِ مِلّت اُن سے ہے — نامِ شرافت اُن سے ہے
ایمان پر قائم ہیں وہ — پاکیزہ و صائم ہیں وُہ

تجھ میں نہیں شرم و حیا
تُجھ میں نہیں مہر و وفا!

سچ سچ بتا تو کون ہے — او بے حیا تو کون ہے
احساسِ عزّت کیوں نہیں — شرم اور غیرت کیوں نہیں
یہ پُر فسوں غمزے ترے — نامحرموں کے سامنے
ہٹ سامنے سے دُور ہو — مردود ہو مقہور ہو
تقدیر کی ہیٹی ہے تُو — شیطان کی بیٹی ہے تُو
جس قوم کی عورت ہے تو — اُس قوم پر لعنت ہے تُو

لیکن ٹھہر جانا ذرا
تیری نہیں کوئی خطا

مَردوں میں غیرت ہی نہیں — قومی حمیّت ہی نہیں
وہ ملّتِ بیضا کہ تھی — سارے جہاں کی روشنی
جمعیّتِ اسلامیاں — شاہنشہِ ہندوستاں
اب اس میں دم کچھ بھی نہیں — ہم کیا ہیں ہم کچھ بھی نہیں
مِلّی سیاست اُٹھ گئی، — بازو کی طاقت اُٹھ گئی

شانِ حجازی اب کہاں — وہ ترکتازی اب کہاں
اب غزنوی ہمّت گئی — اب بابری شوکت گئی
ایمان عالمگیر کا — مسلم کے دل سے اُٹھ گیا
قوم اب جفا پیشہ ہوئی — بلکہ گدا پیشہ ہوئی
اب رنگ ہی کچھ اَور ہے — بے غیرتی کا دَور ہے
یہ قوم اب مٹنے کو ہے — یہ نرد اب پٹنے کو ہے

افسوس یہ ہندوستاں!
یہ گلشنِ جنّت نشاں!

ایمان داروں کا وطن! — طاعت گذاروں کا وطن!
رہ جائے گا ویرانہ پھر — بن جائے گا بُت خانہ پھر

لیکن مجھے کیا خبط ہے
تقریر کیوں بے ربط ہے

ایسا بہک جاتا ہوں مَیں — مُنہ آئی بک جاتا ہوں مَیں

اتنا شرابی ہو گیا عقل و خرد کو کھو گیا
مجھ کو زمانے سے غرض؟ مٹنے مٹانے سے غرض؟
ہندوستاں سے کام کیا اندیشۂ اسلام کیا

جینے دو جینے دو مجھے
پینے دو پینے دو مجھے

جب حشر کا دن آئے گا اُس وقت دیکھا جائیگا
ہاں ناچتی جا گائے جا نظروں سے دل برمائے جا

تڑپائے جا تڑپائے جا
او دشمنِ دُنیا و دیں!

کنجوس سرمایہ دار

آنکھیں اندھی۔ دل بھی اندھا۔ اندھی تیری قسمت بھی
قبر صفت گھر میں بھی اندھیرا۔ اندھی ہے یہ دولت بھی

ظالم تیرے ہاتھوں نے مسکینوں کے دل توڑے ہیں
ظلم کئے ہیں۔ حق چھینے ہیں تب یہ پیسے جوڑے ہیں!

لعنت دُنیا بھر کی تُونے خوب اکٹھی کر لی ہے
لاکھوں جیبیں خالی کر کے اپنی تھیلی بھر لی ہے

مال خزانہ پاس ہے تیرے لیکن اطمینان نہیں
اطمینان کہاں سے آئے جب دل میں ایمان نہیں

یہ بے فیض خزانہ تیرا۔ تیرے کام نہ آئے گا
تو نے دُنیا کو ترسایا یہ تجھ کو ترسائے گا

چین تری تقدیر میں ہرگز او سرمایہ دار نہیں
مزدوروں کی چیخیں ہیں اشرفیوں کی کھنکار نہیں
تنہائی میں اندیشوں کے بھوت ستاتے ہیں تجھ کو
تیری دولت چھیننے والے ہاتھ ڈراتے ہیں تجھ کو
تھیلی کھول کے ہو جاتا ہے حال بُرا ہر بار ترا
کر دے گی یہ دولت آخر اک دن "بیڑا پار" ترا

غزلیات

زخمہ بر تارِ رگِ جاں میزنم

اگر کوئی بے نقاب کر دے

وہ سرخوشی دے۔ کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے مرے لہو کو شراب کر دے

حقیقتیں آشکار کر دے۔ صداقتیں بے حجاب کر دے
ہر ایک ذرّہ یہ کہہ رہا ہے کہ آ مجھے آفتاب کر دے!

یہ خوب کیا ہے۔ یہ زشت کیا ہے جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے؟
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں کہ پتّھروں کے جگر کو بھی آب آب کر دے

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر دے

ترے کرم کے معاملے کو ترے کرم ہی پہ چھوڑتا ہوں
مری خطائیں شمار کر لے مری سزا کا حساب کر دے

حفیظ سب سے بڑی خرابی ہے عشق میں لطفِ کامیابی
کسی کی دُنیا تباہ کر دے کسی کی عقبےٰ خراب کر دے

سزا دے گئے مجھے

یعنی مَیں نامراد بھی ہوں بیوقوف بھی
کچھ اس طرح وہ دادِ وفا دے گئے مجھے

آخر طبیب نے بھی انہی سے کیا رجوع
وُہ آئے مُسکرائے شفا دے گئے مجھے

وُہ مجھ سے آج عہدِ وفا لینے آئے تھے
جاتے ہوئے فریبِ وفا دے گئے مجھے

جن سے کوئی امید نہ تھی اُن سے کیا امید
جن سے امید تھی وہ دغا دے گئے مجھے

فرما گئے بزرگ کہ "عمرت دراز باد"
میری شرارتوں کی سزا دے گئے مجھے

پشیمانیاں ہیں

وفاداریاں سخت نادانیاں ہیں
کہ ان کے نتیجے پشیمانیاں ہیں

پشیمانیاں ہیں گناہوں پہ لیکن
بڑے ہی مزے کی پشیمانیاں ہیں

مری زندگی پر تعجّب نہیں تھا
مری موت پر اُن کو حیرانیاں ہیں

محبّت کرو اور نباہو تو پوچھوں
یہ دشواریاں ہیں کہ آسانیاں ہیں

ندامت ہوئی حشر میں جنکے بدلے
جوانی کی دو چار نادانیاں ہیں

مرا تجربہ ہے کہ اس زندگی میں
پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں

اب تو رہنے دو یہ دُنیا داریاں

حُسن نے سیکھیں غریب آزاریاں
عشق کی مجبوریاں لاچاریاں

بہ گیا دل حسرتوں کے خون میں
لے گئیں بیمار کو بیماریاں

سوچ کر غم دیجئے۔ ایسا نہ ہو
آپ کو کرنی پڑیں غمخواریاں

دار کے قدموں میں بھی پہنچی نہ عقل
عشق ہی کے سر رہیں سرداریاں

اِک طرف جنسِ وفا قیمت طلب
اِک طرف مَیں اور مری ناداریاں

ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیزاریاں

تُم نے دُنیا ہی بدل ڈالی مری
اب تو رہنے دو یہ دُنیا داریاں

گفتگو تو شریفانہ چاہیئے

مل جائے مے تو سجدۂ شکرانہ چاہیئے
پیتے ہی ایک لغزشِ مستانہ چاہیئے

ہاں احترامِ کعبہ و بتخانہ چاہیئے
مذہب کی پوچھیئے تو جداگانہ چاہیئے

رندانِ مے پرست سیہ مست ہی سہی
اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیئے

دیوانگی ہے عشق نہیں ہے کہ خام ہو
دیوانہ ہر لحاظ سے دیوانہ چاہیئے

اس زندگی کو چاہیئے سامانِ زندگی
کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہیئے

او ننگِ اعتبار دعا پر نہ رکھ مدار
او بے وقوف ہمّتِ مردانہ چاہیئے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا
کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیئے

خُدا کا سہارا لئے ہُوئے

میرے خیال و خواب کی دُنیا لئے ہوئے
پھر آگیا کوئی رُخِ زیبا لئے ہُوئے

پھر دل میں آبسی ہے کسی انجمن کی یاد
اُجڑے ہُوئے بہشت کا نقشا لئے ہُوئے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس اُمید پر
بیٹھا رہُوں فریبِ تمنّا لئے ہُوئے

دِل گیسوئے بُتاں میں اُلجھ کر نہ گر پڑے
اُٹھّا تو ہے خُدا کا سہارا لئے ہُوئے

اُس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھیے
اِک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لئے ہُوئے

حسرت برس رہی ہے رُخِ نامُراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنّا لئے ہُوئے

آئی ہے بے حیا مرا ایماں خریدنے
دُنیا کھڑی ہے دولتِ دُنیا لئے ہوئے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی حفیظ
پھِرتا ہُوں اِک جہان کا شکوا لئے ہُوئے

ایجاد میری

نہ کر دلجوئی اے صیّاد میری
کہ فطرت ہے بہت آزاد میری

اسیری سے رہائی پانے والو
تمہیں پہنچے مبارکباد میری

سہارا کیوں لیا تھا نا خدا کا
خدا بھی کیوں کرے امداد میری

بھلا دو مجھ کو لیکن یاد رکھنا
ستائے گی تمہیں بھی یاد میری

فرشتے کیا مرتّب کر سکیں گے
بہت بے ربط ہے روداد میری

پسند آنے لگی تھی سربلندی
یہی تھی اوّلیں اُفتاد میری

کیا پابند نے نالے کو مَیں نے
یہ طرزِ خاص ہے ایجاد میری

مرے اشعار پر چُپ رہنے والے
ترے حصّے میں آئی داد میری

قضا کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے
کوئی سُنتا نہیں فریاد میری

خداوندا قضا نے چھین لی ہے
مرے آغوش سے ارشاد میری

بہت مشہور ہوں مَیں

خرد مند و خرد سے دُور ہوں مَیں
بہت خوش ہوں بہت مسرور ہوں مَیں

مری مجبوریاں کیا پُوچھتے ہو
کہ جینے کے لئے مجبور ہوں مَیں

جلاتے ہو مجھے کیوں چشمکوں سے
نہ موسیٰ ہوں نہ سنگِ طور ہوں مَیں

نہیں کرتا عزیزوں کی شکایت
عزیزو ہاں بہت مغرور ہوں مَیں

مجھے سمجھا رہے ہو۔ جاؤ جاؤ
شہیدِ سعیِ نامشکور ہوں مَیں

مری دُنیا کا سرمایہ ہے عقبیٰ
بڑی تنخواہ کا مزدور ہوں مَیں

کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں
مَیں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں مَیں

مجھے کردو غریقِ حوضِ کوثر
خرابِ بادۂ انگور ہوں مَیں

ہائے۔ دُنیائے فانی

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی
یہ جنت ہے۔ تو ہائے دُنیائے فانی

تو پھر آ گئی گردشِ آسمانی
بڑی مہربانی! بڑی مہربانی!!

سُناتا ہے کیا حیرت انگیز قصّے
حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی

نظر اور ذوقِ نظر دینے والے
عجب شے بنا دی ہے دنیائے فانی

نصیحت سے روکا بہت ناصحوں کو
کسی نے ہماری نصیحت نہ مانی

تسلّی دیئے جاؤ ناداں دل کو
کیئے جاؤ باتیں زبانی زبانی!

حفیظ اپنی بولی محبت کی بولی!!
نہ اُردو نہ ہندی نہ ہندوستانی!

ایماں بھی نثار کرے

گنہ کے بعد بشر عجز اختیار کرے
خُدا کی شانِ کریمی پہ اعتبار کرے

نہ دلدہی نہ تسلّی۔ نہ وعدہ ہے نہ وفا
تمہیں کہو تمہیں کس دل سے کوئی پیار کرے

خُدا پرست وہی ہے جو اس زمانے میں
بتوں پہ جان بھی ایمان بھی نثار کرے

فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار
یہ جس کے پاس نہ ہو صبر اختیار کرے

کوئی اگر دیوانہ ہو جائے

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رُسوا نہ ہو جائے

اُنہیں احساسِ تمکیں ہو کہیں ایسا نہ ہو جائے
جو ہونا ہو۔ ابھی اے جرأتِ رندانہ ہو جائے

بظاہر سادگی سے مُسکرا کر دیکھنے والو!
کوئی کمبخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جائے

بہت ہی خُوب شے ہے اختیاری شانِ خُودداری
اگر معشوق بھی کچھ اور بے پروانہ ہو جائے

ارادے باندھتا ہُوں سوچتا ہوں۔ توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو جائے

الٰہی دلنوازی پھر کریں وہ مَے فروش آنکھیں
الٰہی اتحادِ شیشہ و پیمانہ ہو جائے

مری اُلفت تعجب ہو گئی ۔ توبہ معاذ اللہ!
کہ منہ سے بھی نہ نکلے بات اور افسانہ ہو جائے

یہ تنہائی کا عالم ۔ چاند تاروں کی یہ خاموشی
حفیظ اب لطف اُٹھے ۔ اِک نعرۂ مستانہ ہو جائے

نہ دبے آسماں سے ہم

نا آشنا نہیں رہِ رسمِ جہاں سے ہم
لائیں مگر فریب کی صورت کہاں سے ہم

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر
چپ ہو رہیں کہ کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم

ہاں اس لئے کہ خاک کا رتبہ بلند ہو
مٹ مٹ گئے دبے نہ مگر آسماں سے ہم

اغیار کی بھی آؤ بھگت خوب یاد ہے
اُس روز خوش ہوئے تھے بہت پاسباں سے ہم

اے زندگی سپردِ خدا کر دیا تجھے
بے فکر ہو گئے ترے سود و زیاں سے ہم

وہ روحِ زندگی نہیں شرمندگی سہی
خالی نہ جائیں گے درِ پیرِ مغاں سے ہم

تم سے بھی پوچھا جائیگا

زندگی کا لُطف بھی آ جائے گا
زندگانی ہے تو دیکھا جائے گا

جس طرح لکڑی کو کھا جاتا ہے گھن
رفتہ رفتہ غم مجھے کھا جائے گا

حشر کے دن میری چُپ کا ماجرا
کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

مُسکرا کر مُنہ چڑا کر۔ گھور کر
جا رہے ہو خیر دیکھا جائے گا

کر دیا ہے تم نے دل کو مطمئن
دیکھ لینا سخت گھبرا جائے گا

حضرتِ دل کام سے جاؤنگا میں
دل لگی میں آپ کا کیا جائے گا

دوستوں کی بے وفائی پر حفیظؔ
صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

بہار آئی گلستاں میں

امیدیں مٹ گئیں آخر ہجومِ یاس و حرماں میں
یہ فتنے سو گئے نیند آ گئی آغوشِ طوفاں میں

بڑھا دے کشتیٔ مے ہرچہ بادا باد اے ساقی
خدا کے آسرے پر چھوڑ دے دریائے عصیاں میں

مری آنکھیں ہیں آزادی کی وہ بے رنگ تصویریں
لگی ہیں مدتوں سے روزنِ دیوارِ زنداں میں

خیال و خواب کا ہنگامہ ہے یا اور بھی کچھ ہے
یہ نور و نار کا جھگڑا ہے کیا گبر و مسلماں میں

وہی اک نالۂ ماتم وہی اک نغمۂ شادی
کبھی صیاد کے گھر میں کبھی صحنِ گلستاں میں

کسی زلفِ مسلسل کی حکایت چھیڑ اے ناصح
کہیں تو ربطِ پیدا کر دیا لاتِ پریشاں میں
اِدھر صیّاد پھرتے ہیں۔ اُدھر صیّاد پھرتے ہیں
بہار آئی گلستاں میں۔ بہار آئی گلستاں میں
مجھے بھی تک رہی ہیں اب وہ آنکھیں جن کے جادو سے
غزالانِ حرم آوارہ ہیں کوہ و بیاباں میں
بُری ساعت میں جاگا تھا یہ فتنہ حسن و الفت کا
کہ برپا ہے قیامت آج تک دنیائے انساں میں
بہت آغاز دیکھے ہیں بہت انجام دیکھے ہیں
کئی عبرت کی تصویریں کھنچی ہیں چشمِ حیراں میں
جنوں کی اب نہ پوچھو بس یہ سمجھو سانس لیتا ہوں
یہی اِک تار باقی ہے گریبانِ رگِ جاں میں

کیا ہو گیا ہُوں میں

اے دوست مِٹ گیا ہُوں فنا ہو گیا ہُوں مَیں
اس دردِ دوستی کی دوا ہو گیا ہُوں میں

قائم کیا ہے مَیں نے عدم کے وجود کو
دُنیا سمجھ رہی ہے فنا ہو گیا ہُوں میں

ہنسنے کا اعتبار نہ رونے کا اعتبار
یہ زندگی ہے جس پہ فدا ہو گیا ہُوں میں

ہمّت بلند تھی۔ مگر اُفتاد دیکھنا
چُپ چاپ آج محوِ دُعا ہو گیا ہُوں میں

نا آشنا ہیں رُتبۂ دیوانگی سے دوست
کمبخت جانتے نہیں کیا ہو گیا ہُوں مَیں

یہ زندگی فریبِ مسلسل نہ ہو کہیں
شاید اسیرِ دامِ بلا ہو گیا ہُوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے
محسوس ہو رہا تھا خدا ہو گیا ہُوں میں

خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

مٹنے والی حسرتیں ایجاد کر لیتا ہوں میں
جب بھی چاہوں اک جہاں آباد کر لیتا ہوں میں

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اِتنا اختیار
آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں

حسن بے چارہ تو ہو جاتا ہے اکثر مہرباں
پھر اسے آمادۂ بیداد کر لیتا ہوں میں!

تو نہیں کہتا۔ مگر دیکھ او وفا ناآشنا
اپنی ہستی کس قدر برباد کر لیتا ہوں میں

ہاں یہ ویرانہ۔ یہ دل۔ یہ آرزوؤں کا مزار
تم کہو تو پھر اسے آباد کر لیتا ہوں میں

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظ
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

ملی ہے زندگی فانی مجھے

ہے ازل کی اِس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی مِلا ہے زندگی فانی مجھے

مَیں وہ بستی ہوں کہ یادِ رفتگاں کے بھیس میں
دیکھنے آتی ہے اب میری ہی ویرانی مجھے

تھی یہی تمہید میرے ماتمی انجام کی
پھول ہنستے ہیں تو ہوتی ہے پریشانی مجھے

حُسن بے پردہ ہُوا جاتا ہے یارب کیا کرُوں
اب تو کرنی ہی پڑی دل کی نگہبانی مجھے

باندھ کر روزِ ازل شیرازۂ مرگ و حیات
سونپ دی گویا دو عالم کی پریشانی مجھے

پُوچھتا پھرتا تھا داناؤں سے اُلفت کے رموز
یاد اب رہ رہ کے آتی ہے وہ نادانی مجھے

سب کچھ حسیں ہے

محبت کی دنیا میں سب کچھ حسیں ہے
محبّت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

کہیں زیر دستوں کو راحت نہیں ہے
نہ زیرِ فلک ہے نہ زیرِ زمیں ہے

وہ بیخود ہوں اتنا نہیں جانتا میں
ترا سنگِ در ہے کہ میری جبیں ہے

جزا و سزا نیتوں پر ہے زاہد!
مجھے بھی یقیں ہے تجھے بھی یقیں ہے

گلوں کا تبسّم عنادل کا نغمہ
بہار آفریں ہے کہ درد آفریں ہے

ہم بھی چُپ رہے

اس شوخ نے نگاہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے
ہم نے بھی آہ آہ نہ کی ہم بھی چُپ رہے

آیا نہ اُن کو عہدِ ملاقات کا لحاظ
ہم نے بھی کوئی چاہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

دیکھا کئے ہماری طرف بزمِ غیر میں
تجدیدِ رسم و راہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

تھا زندگی سے بڑھ کے ہمیں وضع کا خیال
جب عمر نے نباہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

خاموش ہو گئیں جو اُمنگیں شباب کی
پھر جراَتِ گناہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظ
ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ہاں جانتا ہوں شوخئ دستِ دعا کو میں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں
ساحل کے رُخ تو لا نہ سکونگا ہوا کو میں

کشتی خدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دوں نہ کہیں ناخدا کو میں

انسان ہوں خطائے وفا بخش دیجئے
بس کیجئے پہنچ تو چکا ہوں سزا کو میں

مطلب پرست دوست نہ آجائے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو میں

نہ مرنا نہ جینا

ابھی چاہتا ہوں بہت روز جینا
بہار آفرینا! بہار آفرینا!!

عبادت کی لذت نہ جی بھر کے پینا
یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا

مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح
مَیں اک روز مر جاؤنگا بس یہی نا!

تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں
کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینہ

مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو
کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینہ

آج کیا کروں؟

کل ضرور آؤ گے لیکن آج کیا کروں
بڑھ رہا ہے قلب کا اختلاج کیا کروں

کیا کروں کوئی نہیں احتیاج دوست کو
اور مجھ کو دوست کی احتیاج کیا کروں

اب وہ فکر مند ہیں کہہ دیا طبیب نے
عشق ہے جنوں نہیں ہے علاج کیا کروں

غیرتِ رقیب کا شکوہ کر رہے ہو تم
اس معاملے میں سخت ہے مزاج کیا کروں

ماسوائے عاشقی اور کچھ کیا بھی ہو
سوجھتا ہی کچھ نہیں کام کاج کیا کروں

محوِ کارِ دیں ہوں میں۔ بوریا نشیں ہوں میں
راہزن نہیں ہوں میں تخت و تاج کیا کروں

زور اور زر بغیر عشق کیا کروں حفیظ
چل گیا ہے ملک میں یہ رواج کیا کروں

اگر خدا نہ مِلا؟

مِلا بھی درد بھرا دل تو کیا۔ مِلا نہ مِلا
ترس کے عمر کٹی۔ درد آشنا نہ مِلا

اُٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے
اِدھر ہی ٹوٹ پڑینگے اگر خدا نہ مِلا

کرم کیا دلِ بے مدعا دیا تو نے
ترے کرم کا مگر کوئی مدّعا نہ مِلا

تمام زادِ سفر راستے میں لُٹ جانا
خُدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ مِلا

رسن کو توڑ کے بھاگے ہیں قیدیانِ وفا
وفا تلاش میں نکلی مگر پتا نہ مِلا

بتوں نے عشق دیا وہ بھی لاعلاج مرض
خدا سے درد بھی مانگا تو لا دوا نہ مِلا

برنگ شعلہ اُڑا ہے مرے شباب کا رنگ
شراب تند ملی تھی مگر مزا نہ مِلا

اپنے ہُنر کو کیا کرُوں

اُن کو جگر کی جستجو۔ اُنکی نظر کو کیا کروں
مجھ کو نظر کی آرزو اپنے جگر کو کیا کروں

رات ہی رات میں تمام طے ہوئے عمر کے مقام
ہو گئی زندگی کی شام۔ اب میں سحر کو کیا کروں

وحشتِ دل فزوں تو ہے حال مرا زبوں تو ہے
عشق نہیں جنوں تو ہے اسکے اثر کو کیا کروں

فرش سے مُطمئن نہیں پست ہے ناپسند ہے
عرش بہت بلند ہے ذوق نظر کو کیا کروں

ہائے کوئی دوا کرو۔ ہائے کوئی دُعا کرو
ہائے جگر میں درد ہے۔ ہائے جگر کو کیا کروں

اہل نظر کوئی نہیں اسلئے خود پسند ہوں
آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہُنر کو کیا کروں

ترکِ تعلّقات پر۔ گر گئی برق التفات
راہگذر میں مل گئے۔ راہگذر کو کیا کروں

زمین و آسماں والے نے مارا

حیاتِ جاوداں والے نے مارا
زباں دے کر زباں والے نے مارا

بشر کو اس قفس میں تنگ کر کے
زمین و آسماں والے نے مارا

نگاہیں کام دیتی ہیں نہ راہیں
مکان و لامکاں والے نے مارا

گوارا ہے دوامی تلخ کامی
کسی میٹھی زباں والے نے مارا

نصیحت گر کو سمجھاؤ خدارا
کہ اس سود و زیاں والے نے مارا

کوئی حد بھی ہے تسلیم و رضا کی
مسلسل امتحاں والے نے مارا

وہ دل میں ہے دل آنکھوں سے نہاں ہے
نشاں دے کر نشان والے نے مارا

سوئے منزل لئے جاتا ہے ظالم
ہمیں اس کارواں والے نے مارا

ہمیشہ کے لئے خاموش ہو کر
نئی طرزِ فغاں والے نے مارا

مجھے کم ظرف کہلانا پڑے گا
متاعِ دو جہاں والے نے مارا

یہ مال پرانا ہے

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے
افسوس مجھے نیند آتی ہے۔ افسوس مجھے سو جانا ہے

اک روز مجھے اس کوچے میں ناصح کو لے کر جانا ہے
کچھ دل کو راہ پر لانا ہے۔ کچھ دلبر کو سمجھانا ہے

معصوم امنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولے میں
یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

دل شیشہ بنے پیمانہ بنے ہم دل کی حقیقت جانتے ہیں
بے رنگ سا اک قطرہ ہے جسے آنسو بن کر بہ جانا ہے

بازار نیا گاہک بھی نئے۔ اب جنس وفا کی قدر نہیں
بے سود نمائش رہنے دے اے دل یہ مال پرانا ہے

اے طائر جاں کچھ روز ابھی اڑنے کی ہوس میں رہنا ہے
اس تنگ قفس میں رہنا ہے۔ دکھ سہنا ہے غم کھانا ہے